Al-Mahdi Research Journal (MRJ)
Vol 5 Issue 4 (April-June 2024)
HJRS HEC Journal Recognition System
Category Y
ISSN (Online): 2789-4150
ISSN (Print): 2789-4142

Localism in Javed Akhter Bhatti's Fiction

جاوید اختر بھٹی کے افسانوں میں مقامیت

Bakhtawar Saleem
M.Phil, Department of Urdu, Institute of Southern Punjab, Multan,
Email: bakhtawarsaleem99@gmail.com

Muhammad Ajmal Khan
M.Phil, Department of Urdu, Institute of Southern Punjab, Multan,
Email: ajmalkhan.ise.pk@gmail.com

Dr. Munawar Amin
Assistant Professor, Department of Urdu, Institute of Southern Punjab, Multan,
Email: drmunawaramin143@gmail.com

ABSTRACT

Javed Akhter Bhatti is one of the prominent writers of Multan, Punjab, Pakistan. His fiction is based on realism and interprets the life of the lower class in a simple way. So far, four of his fiction collections have been published namely "Chand Kay Zakham/Wounds of Moon ,Magar Tum Zinda Rehna/But You Stay Alive, Rabbi Zaat,Sanpon Sey Na Katnay Kay Wichan/The Promise of Not being bitten by snakes ".In the afore-mentioned fiction collections, local issues such as the difference in local routine and standard of living, the attitude of the oppressed towards the oppressor, political influence on local life, bribery, drugs, superstition and the spread of evils like mobile phobia in modern times have been made the subject. Apart from fiction writing, Javed Akhter Bhatti's creative journey has different dimensions. He is also a columnist, critic, researcher and scholar. Apart from this, he has also written books in journalism, history, personality writing, politics and memoir. He studied up to intermediate, but through his research, critical and creative skills, he has proved that art does

not depend on academic degrees. His creative consciousness grew in the face of everyday political, social, psychological, religious, moral events, economic problems and other twists and cons of life. For this reason, the localism is prominent in his writings, especially fiction. The following article attempts to bring out the depiction of local society and culture in Javed Akhter Bhatti's fiction.

Keywords: Oppressed, Superstition, Dimensions, Consciousness, Localism, Oppressor, Depiction.

کلیدی الفاظ:

مظلوم، توہم پرستی، جہات، شعور، مقامیت، تصویر کشی

جاوید اختر بھٹی ۲ فروری ۱۹۵۸ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ پیدائش سے اب تک زندگی ملتان میں ہی گزاری ہے اور اب بھی ملتان میں رہائش پذیر ہیں۔ اس لحاظ سے آپ کی مقامی معاشرت ملتان کی معاشرت ہے جو پورے جنوبی پنجاب کی نمائندہ معاشرت بھی سمجھی جاتی ہے جو زبان، رنگ، نسل، ثقافت اور رسم و رواج کے لحاظ سے باقی پاکستانی معاشرے سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ جاوید اختر بھٹی نے ۱۹۷۷ء میں لکھنا شروع کیا اور اب تک تقریباً ۶۲ سے زائد افسانے اور ۶۴ کے قریب افسانچے لکھ چکے ہیں۔ جو چار مجموعہ جات "چاند کے زخم، مگر تم زندہ رہنا، ربی ذات اور سانپوں سے ناکاٹنے کا وچن" کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

معاشرتی برائیاں ہر معاشرے کا حصہ ہیں اور جاوید اختر بھٹی نے بنیادی طور پر اپنے معاشرے کے مسائل، برائیوں اور معاشرتی رویے کو اپنے افسانوں کے ذریعے عوام کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ آپ کے افسانوں میں مقامی معاشرت کا پہلو تلاش کیا جائے تو منفی چیزیں زیادہ سامنے آتی ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ ملتانی معاشرت منفی پہلوؤں پر ہی منحصر ہے بلکہ اس کی وجہ پہلے ہی بیان کی گئی ہے کہ مسائل، رویے اور برائیاں ہی عوام کے سامنے لانے کے لیے موضوع بنائی گئی ہیں تاہم یہاں میرا مقصد منفی یا مثبت پہلوؤں کا جائزہ لینا نہیں بلکہ ایسے تمام پہلوؤں کو سامنے لانا ہے جو افسانہ نگار کی مقامیت یا مقامی معاشرت کا بیاں ہیں۔

ملتان میں طرزِ زندگی عموماً معاشرے کی طرح تین طبقات میں تقسیم ہے۔ اعلیٰ طبقہ، متوسط اور کمتر یا نچلا طبقہ۔ جاوید اختر بھٹی کے افسانوں میں زیادہ تر نچلے طبقے کی طرزِ زندگی اور معمولاتِ زندگی کا بیان ملتا ہے۔ متوسط اور اعلیٰ طبقے کا بیان اس صورت میں ہوا ہے اگر وہ نچلے طبقے کی زندگی سے جڑے ہیں۔ اس کے علاوہ مقامی معاشرت میں ہر طبقے کا رہن سہن، تہذیب و ثقافت، معاملات اور نظامِ حیات مختلف ہے کہیں مذہب کی جھلک ہے اور کہیں معاشی استحصال۔ اس فرق کے ساتھ افسانہ نگار نے تقریباً ہر طبقے کے افراد کے طرزِ زندگی کو اپنے افسانوں کی زینت بنایا ہے۔ جیسے ہم اگر خانہ بدوشوں کے حوالے سے بات کریں جو ملتان

کے مختلف علاقوں میں شہر سے دور آباد ہیں۔ یہ بے گھر لوگ جہاں خالی میدان دیکھتے وہاں اپنے جھونپڑے لگا کے اپنی بستی آباد کر لیتے ہیں جب تک ذاتی یا حکومتی مکان تعمیراتی کام کے لیے وہ جگہ خالی نہیں کرواتے یہ لوگ اس جگہ کو اپنا مسکن بنائے رکھتے ہیں۔ اور وہاں سے نکالے جانے کے بعد کوئی اور خالی میدان ان کا گھر بن جاتا۔ اسی طرح ان خانہ بدوشوں کی زندگی چلتی ہے۔ افسانہ "شکست کے نام پر" میں ان خانہ بدوشوں کے معمولاتِ زندگی کو عکس بند کیا گیا ہے۔ یہ لوگ روزگار کے لیے قریبی شہروں میں جاتے ہیں۔ عورتیں گھروں کی صفائی اور گندگی اٹھانے کا کام کرتی ہیں اور خانہ بدوش مرد یا تو مزدوری کرتے یا پھر وہ بھی خاکروب کے پیشے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس افسانے کی کہانی کے بنیادی اور مرکزی کردار تین ہیں۔ ایک لڑکی "کالی"، دو مرد "بگا اور راجہ"۔ تینوں کا تعلق ایک خانہ بدوش قبیلے سے ہے۔ کالی گھروں سے گندگی اُٹھاتی ہے راجہ اور بگا دونوں خاکروب ہیں۔ تینوں اپنی بستی سے دور شہر کام کے لیے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو معاشرے کا سب سے کمتر اور نچلا طبقہ شمار کیا جاتا ہے جس کا احساس انھیں خود بھی ہوتا ہے کہ جب ان کے ہاں سیاہ رنگت والی بیٹی پیدا ہوتی ہے تو وہ سیاہ رنگت کو معاشرے کے معیار کے مطابق بدصورتی کی علامت گردانتے ہوئے بیٹی کا نام "کالی" رکھتے ہیں۔

> "اس لڑکی کی رنگت سیاہ تھی _____ بالکل سیاہ، ماں باپ اعتراف میں اس کا نام "کالی" رکھ دیا تھا، کالی کے آنسو سپید تھے، _____ سچے موتیوں کی طرح _____ جسم میں سرخ خون گردش کر رہا تھا، سینے میں محبت کرنے والا دل تھا، اس کے اندر کہیں سیاہی نہ تھی، مگر باہر سے سراپا کالی تھی۔"[۱]

یہ ہمارے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت ہے کہ سیاہ، کالے رنگ کے لوگوں کو نہ صرف حقیر بلکہ جذبات سے عاری اور اندر سے بھی سیاہ سمجھا جاتا ہے اور ہمارے سماج کی ایسی لڑکیاں سیاہ رنگت کے باعث بدصورت تصور کر کے عمر بھر کنواری بیٹھتی رہتی ہیں کیونکہ اُنھیں محبت یا شادی کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ سیاہ رنگ کو بدصورتی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور شادی کے لیے خوبصورتی کو اہمیت دی جاتی ہے۔ دوسری طرف "بگا" جس کی رنگت بھی گندمی ہے چونکہ ماں باپ نے چاہت سے نام بگا رکھ دیا تو اُسے کالی کے سامنے اپنے نام کے بگا ہونے پہ بڑا ناز ہے۔ تیسرا کردار "راجہ" کا ہے جو پیشے کا خاکروب ہے مگر بدمعاش ہے اور کالی کو پسند کرتا ہے۔ اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر "کالی" بگے کو پسند کرتی ہے اور "بگا" جہاں کام کرتا ہے وہاں ایک بڑے گھرانے کی پڑھی لکھی لڑکی "کنول" سے محبت کرتا ہے۔ معمولات زندگی کے ساتھ اس افسانے میں جذبات و احساسات کا بیان ایسی سماجی حقیقتوں کا انکشاف ہے جس سے معاشرے کا ہر فرد، جو درجہ چہارم سے منسلک ہے، دوچار ہے۔ یہ اور بات ہے کہ افسانہ نگار نے رومانوی جذبات نگاری سے کہانی کو آگے بڑھایا ہے مگر اس کے ساتھ قاری کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ معاشرے کے ان نچلے طبقے سے منسلک ان خانہ بدوشوں کی زندگی بھی محبت اور رومانوی جذبات کی حامل ہوتی ہے۔ لڑکیاں "کالی" کی صورت میں بھلے سیاہ اور معاشرتی معیار کے مطابق بدصورت ہوں مگر "راجہ" جیسے بدمعاش خاکروب بھی شادی کر کے اپنانا چاہتے اور انکار کرنے پہ بدنام

کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ دوسری طرف "بگا" کی صورت میں مرد اپنی معاشرتی حیثیت، پیشہ اور حقیقت جانتے ہوئے بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر محبت کے پھول اگا لیتے ہیں۔ دوسری طرف ان خانہ بدوشوں کے علاوہ مقامی معاشرت میں دیہات کی زندگی ہے زیادہ تر دیہاتی خود دار ہیں اور اپنی تھوڑی سی زمین اور ایک مویشی سے ہی ضروریات پوری کر کے زندگی گزارتے ہیں اور ان کی عورتیں آمدن میں اضافے کے لیے بڑے گھروں میں کام کرنے کے بجائے کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ دیہات میں دن کا آغاز افسانہ "احساس" میں صبح کا ایک منظر بیان کر کے کیا گیا ہے جس میں شہری اور دیہاتی زندگی کا فرق بھی واضح ہوا ہے کہ شہروں میں صبح اُٹھ کر لوگ سیر، دفتروں اور مارکیٹوں میں نوکری، ملازمت اور روزگار کے لیے نکلتے ہیں جبکہ دیہات میں اپنی زمینوں، کھیتوں اور کنوؤں پر روزمرہ کام نمٹانے نکلتے ہیں:

> "اب چاند کی ٹھنڈی چاندنی سورج کی تپش میں تبدیل ہو چکی تھی، دُنیا جاگ اُٹھی تھی، کنویں پر رونق ہو گئی تھی، بیل زمین کا سینہ چیر رہے تھے، کسان زمین کے زخموں میں بیج بو رہا تھا، زمانے کا کھیل پھر شروع ہو چکا۔"[۲]

دیہات میں دیہاتی عورتیں فصلوں کی بوائی، کٹائی، چنائی یا پھر روزمرہ کے کام جن میں اپنے مویشیوں کے چارے کے لیے گھاس کی کٹائی میں وغیرہ میں اپنے مردوں کے ساتھ کھیتوں میں شانہ بشانہ کام کرتی نظر آتی ہیں۔ کھیتوں کے کچھ کام خصوصاً عورتوں کے لیے مختص کیے ہوتے ہیں جیسے گندم کی کٹائی یا کپاس کی چنائی وغیرہ۔ ان فصلوں کے موسم میں عورتیں مل کر زمینوں اور کھیتوں میں جاتی ہیں۔ اپنے گھر کی مقید اور مصلوب شخصی زندگی سے الگ ہو کر اپنے رشتے دار اور پڑوس عورتوں، سہیلیوں کے ساتھ کھیتوں میں کٹائی یا بوائی کے لیے جانا آزادی کے ایک خوشگوار احساس سے کم نہیں ہوتا۔ آزادی کے یہ لمحے اُن کے جذبات میں ایک ایسا خوشگوار احساس بھر دیتے ہیں جو اُس سے پہلے حدود یا قیود کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ افسانہ "چبھن" میں افسانہ نگار نے دیہاتی عورت کے معمولاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ عورتوں کی دیہاتی تہذیب و ثقافت کو بھی بیان کیا ہے کہ ماحول، موسم اور آب و ہوا کی ہر سختی برداشت کرنے والی دیہاتی لڑکیوں کا رنگ زیادہ سفید اور شفاف نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ پردے کا اہتمام ڈوپٹے کو اوڑھ کر لازماً کرتی ہیں۔ سادگی اور معصومیت کے باعث شرمیلی بھی زیادہ ہوتی ہیں:

> "اب وہ آہستہ سے لڑکی کی طرف مڑا، اُس کے سامنے سانولے رنگ کی ایک نوجوان دیہاتی لڑکی کھڑی تھی۔ سر پر ڈوپٹہ، آنکھوں میں شرم و حیا لیے۔"[۳]

جاوید اختر بھٹی نے شہر میں رہتے ہوئے دیہاتی معاشرے کے رہن سہن، رسم و رواج اور معمولاتِ زندگی کا بغور مشاہدہ کیا ہے اور بڑی خوبصورتی سے دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو عکس بند کیا ہے۔ اس کے علاوہ طرزِ زندگی اور رہن سہن کے حوالے سے ہمارے معاشرے میں مشترکہ خاندانی نظام قائم ہے۔ مسلم سماج میں اس کے جہاں فوائد ہیں وہاں اس کے

CC BY

نقصانات بھی سامنے آئے ہیں۔ مقامی معاشرت کے اس پہلو کا بغور مشاہدہ کر کے افسانہ نگار نے اسے قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ دراصل معاشرے کی ہر عورت شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ الگ گھر میں رہنا چاہتی ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس پر اپنے سسرال اور دوسرے رشتہ داروں کی ذمہ داری نہ ہو۔ وہ مشترکہ گھر اور ماحول میں ذہنی سکون محسوس نہیں کرتی اگرچہ وہ اچھے سے اچھے گھر میں ہی کیوں نا رہ رہی ہو۔ افسانہ "ایک دن" کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> "میں نے کہا "ہمارے پاس اپنا مکان ہے۔" مگر اس کی سمجھ میں میری بات نہ آئی، اس کے دل پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، اس کا خیال تھا کہ ہم بہتر زندگی بسر نہیں کر رہے۔ اس نے کہا "ایک تو یہ مکان نہیں، دوسرا یہ مکان تمہارا نہیں تمہارے باپ کا ہے اور اس میں تمہارے بھائی برابر کے حصہ دار ہیں۔"[۴]

درج بالا اقتباس ہمارے معاشرے میں رائج مشترکہ خاندانی نظام کی عکاسی کرتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر گھرانوں میں بیٹے کی شادی کے بعد اُس کا الگ گھر لینا یا الگ رہنا معیوب سمجھا جاتا ہے اور خاندانی مشترکہ نظام کے اُصول کے آگے بیٹے تو جھک جاتے ہیں مگر ان کی بیویاں اسے ناجائز خیال کرتے ہوئے تسلیم نہیں کرتیں اور ساس، سسر کے حیات رہنے تک برداشت کرتی ہیں۔ اُن کے گزر جانے کے بعد تمام بیٹے یا بھائی وراثت میں سے اپنا حصہ لے کے الگ ہو جاتے ہیں۔ کچھ کم عقل اور بے شعور اولادوں میں والدین کے کفن، دفن، قُل اور چہلم پر اخراجات میں بھی جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے جو بعد میں گھر کی تقسیم اور سب کے الگ ہو جانے کا باعث بنتا ہے۔

> "کسی بھائی نے زیادہ پیسے دیئے کسی نے کم، کفنا آیا، مردہ دفن ہوا۔ قل خوانی ہوئی، چہلم ہوا اور پھر وہی ہوا۔ جو ہوتا آیا ہے۔ ایک کی بیوی نے کہا "تمہارے خاوند نے باپ کی بیماری پر کیا کیا؟" اس نے کہا۔ "تمہارے خاوند نے کیا کیا"۔ اور اس "کیا کیا؟ کیا کیا؟" کی تکرار میں طے یہ ہوا کہ گھر کو تقسیم کر لیا جائے۔ "اس دس مرلے کے مکان کو کیا تقسیم کر لیتے، بات دانش مندی کی تھی اس مکان کو فروخت کر دیا جائے۔ اور ہم تمام بھائی کرائے کے مکانوں میں چلے گئے۔"[۵]

ہمارے معاشرے کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ اولاد جوان ہو جانے کے بعد اور بالخصوص شادی اور بچے ہونے کے بعد والدین کو بوجھ سمجھتی ہے اور اُن سے چھٹکارہ چاہ رہی ہوتی ہے۔ بیویاں اگر پہلے دن سے الگ گھر میں رہنا چاہتی ہیں تو شوہر پہلے نا سہی تو اپنی اولاد ہوتے وہ بھی الگ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

> "کچھ برس بہت اچھے گزرے۔ بہت خوبصورت اور یادگار، اس میں کہیں میری شادی ہوئی، بچے ہوئے، بچے جوان ہوئے اور پھر بچے، جوان بچے مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اب میں اکیلا ہوں۔ ایک چھوٹے سے مکان میں تنہا رہتا ہوں۔۔۔۔۔ یہ میری زندگی کا سب سے تکلیف دہ زمانہ ہے۔"[۶]

درج بالا اقتباس افسانہ "دوسرے باپ" سے لیا گیا ہے جس میں افسانہ نگار نے اس معاشرتی المیے کو بیان کیا ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام آج کے زمانے میں نوجوان اور نئی نسل کے لیے ناقابلِ برداشت ہے اِس سے خاندانی مسائل بڑھ جاتے تو دوسرے طرف اولاد والدین کا مقام، رتبہ اور احسانات بھی بھول جاتی ہے۔ یہاں اس حوالے سے افسانہ نگار نے معاشرے کے ان لوگوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو دیہات کے پیدائشی اور رہائشی ہوتے ہیں جنہیں تعلیم اور شعور دینے کے لیے والدین پیسہ جوڑ کے شہروں میں بھیجتے ہیں تاکہ پڑھ لکھ کر سماج کی اونچ نیچ کو اچھے سے سمجھ سکیں اور والدین کا سہارا بن سکیں مگر شہر جاکر وہ نا صرف اپنا طرزِ زندگی بدل لیتے ہیں بلکہ دیہاتی ماحول اور بوڑھے دیہاتی والدین گنوار اور دقیانوسی لگنے لگتے ہیں۔

> "کیا تُو خود کو میرے ساتھ بمبئی میں میرے فلیٹ میں رہنے کے قابل سمجھتی ہے لوگ مجھ سے پوچھیں گے کہ یہ تمہاری ماتا ہے؟ دقیانوسی ماتا، تو میں کیا جواب دوں گا انہیں۔"[۷]

درج بالا اقتباس افسانہ "مالا کا موتی" سے لیا گیا ہے۔ یہ افسانہ ہمارے معاشرے کی نئی نسل کی کچی اور نوزائیدہ سوچ کا عکاس ہے جو شہروں میں جاکے نا صرف طرزِ زندگی بدل لیتے ہیں بلکہ دیہات کے سادہ مزاج بوڑھے والدین کو گنوار اور دقیانوسی سمجھ کے انہیں اپنے ساتھ لے جانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ جس روشن خیالی اور آزاد خیالی کے لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں وہ تعلیم ان کا طرزِ زندگی تو بدل دیتی ہے مگر تہذیب و شعور حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

ہمارے معاشرتی زندگی میں ہوٹلوں کا اہم کردار ہے۔ شہروں میں موجود چھوٹے اور سستے چائے کے ہوٹل نچلے طبقے کے آدمی کے لیے ذہنی تازگی کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔ جس میں سارا دن لوگ اس طرح بیٹھے رہتے ہیں کہ جیسے انہیں دنیا میں کوئی کام ہی نہیں۔ وہ آزاد ہیں۔ ان کا کوئی گھر نہیں اور وہ قیامت تک اسی ہوٹل میں بیٹھ کے زندگی گزار دیں گے۔ افسانہ "چوراہے پہ دوستی" میں افسانہ نگار معاشرے کے ایسے بے فکر لوگوں کو بیان کر رہا ہے اس کے علاوہ افسانہ "ایک دن" میں بھی اس کے متعلق افسانہ نگار لکھتا ہے:

> "میری زندگی کا سب سے خوشگوار تجربہ دوست کے ساتھ ہوٹل میں پہلی مرتبہ چائے پینا تھا۔ ہمارے معاشرے میں، ہمارے عہد میں، ہماری طرح کے نوجوان، زندگی کی عیاشی کا آغاز ہوٹل میں چائے پی کر کیا کرتے تھے۔"[۸]

ہمارے معاشرے میں شادی پر جہیز دینا ایک رسم اور رواج کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ غریب طبقہ تو اس سے متاثر ہے ہی مگر متوسط طبقے کو بھی اس رواج کی وجہ سے اولاد کی شادیوں میں مختلف مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ ہر طبقے کے لوگ بیٹی ہو یا بیٹا، داماد ڈھونڈنا ہو یا بہو، اپنے سے بڑے گھر اور اعلیٰ معیار کو ترجیح دیتے ہیں۔ یعنی دولت اور بھاری جہیز کو شادی کے لیے معیار بنا لیا گیا ہے۔ تبھی یہیں سے دیکھا دیکھی جہیز ایک رواج کی صورت اختیار کر گیا ہے

CC BY

جس کو نبھانے کی انسانی نفسیاتی سوچ بیٹی کی پیدائش سے ہی فکر میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ والدین پیسہ اور سامان جوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ نچلا طبقہ جو پہلے ہی اپنا اور بچوں کا پیٹ بمشکل پالتا ہے۔ اس جہیز کے نا ہونے پہ اُن کی بیٹیاں یا تو کنواری رہ جاتیں یا کسی امیر بوڑھے کی پسند بن کے اس سے بیاہ دی جاتی ہیں۔ انھیں معاشرہ نا تو محبت کے لائق سمجھتا ہے اور نا ہی شادی کے قابل۔ اِسالیے کو افسانہ نگار نے ایک تو افسانہ "چبھن" کی "رجو" اور افسانہ "شکست کے نام پر" کی "کالی" کے کردار میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے، افسانہ "احساس" میں بھی اسے خوبصورتی سے پرویا ہے۔ اِس کا مرکزی کردار "بشیراں" ہے جس کے جوان ہوتے ہی ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہے مگر جہیز میں دینے کو دعاؤں کے علاوہ کچھ نہیں اور نہ ہی ایسا کوئی لڑکا ہے جس سے بنا جہیز کے بیاہ دیں۔

> "رشتے تو بہت ہیں، لیکن روپے نہیں، جہیز نہیں، کچھ بھی نہیں۔ دولت مند کے گھر تو بر خود چل کے آجایا کرتے ہیں، لیکن کچھ نا ہو تو، پھر بہت دور چلے جاتے ہیں، اس قدر کہ آدمی خود کو بڑے بڑے شہروں میں بھی تنہا محسوس کرتا ہے۔"[۹]

اس افسانے میں گاؤں کا بوڑھا چوہدری نوجوان "بشیراں" سے بیاہ کرنا چاہتا ہے اور ماں باپ جہیز کے بغیر بیٹی بیاہنے کی فکر اور پریشانی کو ختم کرنے کے لیے اور چوہدری کا دولت مند ہونا دیکھ کر راضی ہو جاتے ہیں کہ ان کی بیٹی چوہدرائن بن کر راج کرے گی۔ مگر بوڑھا چوہدری شادی ہونے سے پہلے ہی مر جاتا ہے اور نوجوان "بشیراں" شادی سے پہلے بیوہ ہو جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں جہیز کو ہی معیار بنالیا گیا ہے اس کی جگہ اگر سادگی اور شرافت کو معیار بنایا جائے تو نوجوان لڑکیاں بروقت گھر سدھار سکتی ہیں۔ یہاں مسئلہ جہیز دینے کا نہیں بلکہ جہیز لینے کا بھی ہے۔ افسانہ "تصویریں" کا اقتباس ملاحظہ ہے:

> "بشیر کے ماں باپ کو اب اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ ایک سے ایک خوبصورت لڑکی دیکھی گئی، مگر کوئی پسند نہ آئی۔ آخر ایک گہرے سانولے رنگ کی لڑکی سے اس کی شادی ہو گئی کیونکہ سانولے رنگ کی لڑکی کا باپ شہر کا سب سے بڑا سیٹھ تھا۔ لڑکی جہیز میں ڈھیر ساری تصویریں لائی۔"[۱۰]

درج بالا اقتباس میں لفظ "تصویریں" روپے پیسے کے لیے استعارہ استعمال ہوا ہے۔ اکثر گھرانے تو رشتہ ہوتے جہیز میں من پسند سامان بتا دینے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ غریب طبقے کی بیٹیاں کنواری بیٹھی رہتی ہیں۔ انھیں غربت کی وجہ سے شادی کے لائق نہیں سمجھا جاتا دوسری طرف متوسط اور اعلیٰ گھرانے کے لڑکے اپنے خاندان، علاقے یا اپنے معیار کے مساوی طبقے کی لڑکی کے بجائے اونچے طبقے کی لڑکی چاہتے ہیں اور اگر ان کی جیب اجازت دے تو غیر ملکی بیوی لانا باعث فخر خیال کرتے ہیں۔ مگر یہ نہیں سوچتے کہ اپنی مقامی معاشرت میں پلنے والی لڑکیاں ہی اس معاشرے میں رہ سکتی ہیں، گھر بسا سکتی ہیں، اسی معاشرے میں ڈھل سکتی ہیں جبکہ باہر کے لوگ مقامی رنگ، نسل، معاشرت کو ہمیشہ نیچ خیال کرتے ہیں اور خود کو برتر سمجھتے ہیں۔

"ولائتی نوٹ تو پاکستانی نوٹوں میں تبدیل ہو گئے مگر ولائتی بیوی پاکستانی بیوی میں تبدیل نہ ہو سکی _____ سنا ہے کہ وہ یہاں گھٹن محسوس کرتی تھی، اسے یہاں کے غریب لوگوں سے گھن آتی تھی، یہ گلی محلے میں کھیلنے والے ننگے بچے، جن کی رنگت سیاہ ہے _____ یہ کالی کلوٹی عورتیں جو خود کو کالے برقعے میں چھپائے پھرتی ہیں _____ بھوک سے بلکتے بچے _____ ٹوٹی ہوئی کھولیاں _____ بڑے لوگوں کی بڑی توند _____ سبھی کچھ اس کے لیے قابلِ نفرت تھا، _____ وہ کیسے محبت کر سکتی تھی، جبکہ اس کے بڑوں نے سو سال حکومت کی لیکن محبت نہ کی، وہ بے چاری بھی کیا کر سکتی تھی _____ ابتداء یورپ میں ہوئی، _____ انتہاء غلیظ ایشیاء، غلیظ ملک کے غلیظ شہر میں ہو رہی تھی۔"[۱۱]

درج بالا اقتباس ہمارے معاشرے کے ایسے رسم و رواج کا بیان ہے جو معاشرتی ابتری کا باعث بنتے ہیں۔ دوسری طرف اولاد نا ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کرنا بھی ایک رواج بن چکا ہے۔ اس حوالے سے افسانہ "چاند کے زخم" خصوصی اہمیت کا حامل ہے اس افسانے میں بیک وقت ہمارے معاشرے کے بہت سے پہلو سامنے آئے ہیں مگر یہاں موضوع کے حوالے سے جو بڑی بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ شہر کے پڑھے لکھے اور باشعور لوگ یہ جانتے ہوئے کہ اولاد اللہ کی عطا ہے اس میں کسی انسان کا دوش نہیں ہوتا پھر بھی عورت کو قصوروار سمجھتے ہوئے محبت پر ضرورت کو اہمیت دیتے ہیں۔ "افتخار صاحب" نے محبت کی شادی کی اور آٹھ سال گزرنے کے بعد بے اولادی کے باعث دوسری شادی کے خواں ہیں:

"افتخار صاحب کاروباری آدمی تھے، ایک کاروباری اپنی دولت صرف اپنی اولاد کو خوشی سے دے سکتا ہے، جو ان کے پاس نہیں تھی، افتخار صاحب کو اس بات کا احساس شدت سے ہو رہا تھا، انھیں اپنی بیوی سے بہت محبت تھی، لیکن اولاد کی ضرورت _____ کاروباری آدمی میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ محبت پر ہر ضرورت کو اہمیت دیتا ہے۔"[۱۲]

کسی بھی معاشرے میں بسنے والے افراد کا معاشرتی اور اخلاقی رویہ اُس علاقے کی پہچان ہوتا ہے اور روزمرہ زندگی میں ہونے والے واقعات میں ہمارا مثبت یا منفی رویہ۔ محبت یا نفرت کے جذبات، خلوص، ریاکاری، غصہ یا کسی بھی جذباتیت پر مبنی رویہ ہماری مقامیت کی پہچان ہوتا ہے۔ مقامی معاشرت کے حوالے سے جاوید اختر بھٹی نے اپنے افسانوں میں جابجا مختلف طبقات کے افراد کے سماجی رویے کی عکس بندی بھی کی ہے۔ افسانہ "چاند کے زخم" اس حوالے سے اہمیت کا حامل ہے جس میں مختلف طبقات کے رویے سامنے آتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہے:

"ایک دن اس نے اپنی مالکن کو اپنی بیٹی سے یہ کہتے سن لیا "شرماں کو منہ زیادہ مت لگایا کرو، ان غریب لوگوں سے ذرا ہمدردی کرو، تو سر پر چڑھ جاتے ہیں، کم بخت _____"[۱۳]

درج بالا اقتباس ہمارے معاشرے کے اکثر گھرانوں میں کام کرنے والے لوگوں کے ساتھ رکھے جانے والے رویے کی تصویر کشی کر رہا ہے کہ یہ بڑے گھرانوں کے لوگ اداکار اور مکار ہوتے ہیں ان سے ہنس کر بات کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے گھر کے کام کرنے والوں کے لیے محبت یا خلوص رکھتے۔ اس کے برعکس نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی "شرماں" کا رویہ ہمارے معاشرے کے مثبت سماجی رویوں کی ایک خوبصورت مثال ہے جو صرف خلوص، احساس، ہمدردی بلخصوص انسانیت کی تعظیم کو اہمیت دیتی ہے۔ جب وہ افتخار بیگم کے گھر کام کرتی ہے تو افتخار بیگم کے خلوص سے متاثر ہو کر زیادہ تنخواہ دینے والے گھروں میں کام کی آفر کو ٹھکرا دیتی ہے۔ اور جب مالکن کا شوہر اولاد نا ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کی بات کرتا ہے تو اپنی مالکن پہ سوکن آنے کا سن کے شرماں کو اپنا وقت اور دکھ یاد آجاتا ہے کہ اس کے شوہر نے کسی اور لڑکی پہ دل آجانے کی صورت میں اُسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ شرماں کو افتخار بیگم سے ان کے خلوص کی وجہ سے دلی لگاؤ ہے تبھی ان کا دکھ اسے اپنا محسوس ہوتا ہے وہ مالکن کا گھر بچانے کے لیے افتخار صاحب کو اپنا اکلوتا لختِ جگر، جو چھے ماہ کا ہے، دینے کی پیشکش کرتی ہے تاکہ وہ دوسری شادی نہ کرے۔ مگر افتخار صاحب کا کاروباری انداز میں کچھ یوں شرماں کے خلوص، ممتا اور خصوصاً غربت پر طمانچہ رسید کرتے ہیں:

> "افتخار صاحب مسکراتے ہوئے اپنی کرسی سے اُٹھے اور شرماں کے بالکل قریب آگئے، کچھ دیر خاموش کھڑے مسکراتے ہوئے کبھی شرماں کو گھورتے کبھی گلو کو۔ پھر انھوں نے گلو کے پھولے ہوئے گال پر ہلکی سی چپت لگائی اور کہا_____ "کس سیٹھ کا ہے؟"[۱۴]

یہ نچلے اور پسے ہوئے طبقے کے لوگ جو خود احساس محرومی کا شکار ہوتے ہیں اپنے مالکان کے خلوص اور محبت کی وجہ سے ان کے لیے اپنے خونی رشتوں کی بھی قربانی دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ انسانیت کے لیے ہمدردی ہمارے معاشرے کا حصہ ہے مگر تمام معاشرہ یہ جذبہ رکھے ایسا ممکن نہیں ہے، برے لوگوں کے ساتھ معاشرے میں اچھے لوگ بھی بستے ہیں۔ افسانہ "بے نام" میں اس کی عکاسی یوں کی گئی ہے:

> "اسی ہسپتال میں میرے والد زیر علاج تھے، اُنھیں معلوم ہوا کہ ایک انتہائی غریب لڑکے کو ہسپتال سے چھٹی دی جا رہی ہے، جو کسی طور بھی صحت یاب نہیں ہوا۔ میرے والد نے ڈاکٹر صاحب سے بات کی، تو معلوم ہوا کہ لڑکا اس قابل نہیں کہ معمولی سے دوائی خرید سکے، حالانکہ اسے خون کی سخت ضرورت ہے، میرے والد نے اخراجات کی حامی بھر لی اور اسے علاج کے لیے روک لیا گیا۔"[۱۵]

ہمارا معاشرہ ایسے ہمدرد لوگوں سے بھرا ہوا ہے مگر معاشرتی برائیاں اس قدر حاوی ہیں کہ یہ اچھائیاں دب جاتی ہیں۔ طبقاتی استحصال ختم نہیں ہو پاتا۔ اس کے باوجود یہ نوکر، ملازم اور نچلے طبقے کے لوگ جو غربت، مفلسی، بھوک کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں انھیں صرف اپنا نہیں بلکہ گھر والوں کا بھی پیٹ پالنا ہوتا ہے اس کے ساتھ بہن یا بیٹی کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔ اس ذمہ

داری کے حوالے سے افسانہ نگار نے معاشرتی رویے کا ایک رخ بیاں کیا ہے وہ یہ کہ شادی کے لیے ماں باپ کا فیصلہ بیٹی کو ماننا پڑتا ہے، بیٹی کی مرضی کو اہمیت دینا تو دور کی بات، معلوم تک نہیں کی جاتی۔ یہ الگ بات ہے کہ بیٹیاں ماں باپ کے فیصلے کا احترام کرتی ہیں مگر معاشرے نے والدین کے اس فیصلہ مسلط کرنے والے رویے کو اُصول کی شکل دے رکھی ہے۔

> "کہتی تو ٹھیک ہے، بشیر اں کی اماں، مگر بشیر اں پسند کرے گی اُسے؟ "یہ کیا بات کہہ دی بشیر اں کے ابا، کبھی بیٹیاں بھی بولی ہیں وہ تو گائے ہوتی ہیں، رسّہ کھول کر جس کے ہاتھ میں تھما دو، اسی کے ساتھ چلی جائیں گی۔"[۱۶]

اس کے علاوہ افسانہ "گندم کا عریاں دانہ" میں ایک بے گھر اور لاچار عورت کے ساتھ معاشرے کے رویے کو بیان کیا گیا ہے۔ پہلے پہل اس کی زندگی جنگ و جدل کے دنوں نے تباہ کر دی پھر روزی روٹی اور اپنا پیٹ پالنے کے لیے گھر میں کام کرنا شروع کیا تو چند دنوں بعد مالکن نے کام سے نکال دیا کہ اس کا شوہر اس پہ مہربان ہے۔ ایک بے گھر اور لاچار عورت کہاں جاتی اس نے کھلے آسمان تلے ایک جگہ کو اپنا مسکن بنالیا اور جس جگہ اس نے ڈیرہ ڈالا وہاں قریب بسوں کا اڈا ہے۔ آتے جاتے ڈرائیور اُسے آنکھ مارتے اور وہ جواب میں انھیں پتھر مارتی ہے۔ جب پتھر ختم ہو جاتے ہیں تو پھر وہ بے بسی سے رونے لگتی ہے۔ سردیوں کی ایک طویل رات میں آسمان جم کے برسا تو سر ڈھانپنے کے لیے قریب کے ہر گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر اُسے چھت کہیں میسر نہ ہوئی بلآخر اس نے انھی بس ڈرائیوروں کے ہاتھ اپنا بدن بیچ دیا۔

> "بارش تیز ہو رہی تھی۔ تمام دروازے بند تھے۔ اس نے بہت سے دروازوں پر دستک دی۔ دروازے بول رہے تھے۔ گھروں میں رہنے والے بہرے ہو چکے ہیں۔ صبح ہو چکی تھی _____ بارش رک گئی تھی _____ گونگی ڈرائیوروں کے ایک مکان سے باہر نکل رہی تھی _____ خاموشی ٹوٹ چکی تھی _____ اُسے اپنی ہی کرچیاں چُبھ رہی تھیں۔"[۱۷]

یہاں ہمارے معاشرے کے مردوں کا رویہ بلخصوص سوچ ایک المیہ ہے کہ سڑکوں پر بھیک مانگتی عورتیں مفلس، مجبور و لاچار ہوتی ہیں وہ جنسی تسکین کے بجائے روٹی کی طلب رکھتی ہیں۔ اُن کی مجبوری کا فائدہ اُٹھانے کے بجائے معاشرے کا مرد روٹی اور چھت دے کر سہارا دینے کا سوچیں تو معاشرہ کسی حد تک برائیوں سے پاک ہو سکتا ہے۔

جاوید اختر بھٹی چونکہ ستر کی دہائی میں لکھنے والے کہانی کاروں میں شامل ہیں تو اس دہائی کا آغاز مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بھارت کے ساتھ جنگ جیسے واقعات سے ہوا۔ اس صورتحال میں ملک، قوم اور ہر مقامی آدمی نے جس طرح کا اثر لیا خصوصاً معاشرے میں سیاسی ابتری نے جس طرح مقامی زندگی کو متاثر کیا اسے ہر کہانی کار نے ادب میں سمویا ہے۔ جاوید اختر بھٹی نے بھی اپنے افسانوں میں ایسی سیاسی صورتحال کے زیر اثر مقامی معاشرت کی عکس بندی کی ہے۔ خصوصاً جنگ میں جو لوگ مارے اور جو

علاقے اس کے زیر اثر آتے ہیں وہاں کی عورتیں یا تو بیوہ یا پھر بے گھر ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں ان کی باقی ماندہ زندگی ذلت و رسوائی میں گزر جاتی ہے۔ "گندم کا عریاں دانہ" ایسا افسانہ ہے جو جنگ کے بعد مقامی زندگی کے اجڑنے کا عکاس ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک عورت ہے جو دیکھنے میں گوری چٹی، خوبصورت، دراز قد مگر ادھیڑ عمر اور گونگی ہے۔ متکلم کے پڑوس میں کام کرتی ہے مگر اسے کام سے نکال دیا گیا کہ مالکن کا شوہر اس پر مہربان ہے تبھیما لکن اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ بے گھر ہونے کی وجہ سے کھلے آسمان تلے ٹوٹی چارپائی اور میلے بستر پر رہنے لگی۔ قریب بسوں کا ایک اڈا ہے، اردگرد کے مرد اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے میلی نظر سے دیکھتے ہیں مگر وہ گونگی فی الحال اپنے بدن پر پہرہ دے رہی ہے۔ ڈرائیور گزرتے ہوئے اسے آنکھ مارتے ہیں، جواباً انھیں پتھر مارتی ہے۔ دوسری طرف کوئی دردِ دل اور احساسِ انسانیت رکھنے والے کبھی کبھار آتے جاتے اسے باسی روٹی بھی دے جاتے متکلم بھی انھی میں شامل ہے۔ وہ فاقہ زدہ عورت اشاروں سے اپنا ماضی بتاتی ہے:

> "وہ اشاروں سے بتاتی کہ اس کا خاوند تھا _____ بہت سی نوکرانیاں تھیں۔ کئی کھیت تھے۔ بھینسیں تھیں۔ وہ چوہدرائن تھی _____ پھر اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں، وہ اشارے سے بتاتی کہ جہاز آئے سب کچھ ختم کر گئے _____ جنگ کتنی مختصر تھی _____؟"[۱۸]

جاوید اختر بھٹی نے اپنے بچپن میں ایوب خان کے دور کا مارشل لاء دیکھا اور اس کے بعد جنرل ضیا الحق کے دورِ حکومت کے مارشل لاء کے تو عینی شاہد ہیں تبھی آپ کی افسانہ نگاری میں اکثر افسانے علامتی انداز میں لکھے گئے ہیں جن سے وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مارشل کے اثرات اور نقصانات کے زیر اثر معاشرے اپنی معاشرت، تہذیب اور معاشی ترقی سے ابتری کی طرف دھکیل دیئے جاتے ہیں جہاں سے موجودہ حالت میں واپس آنے کے لیے سو سال کا عرصہ بھی لگ جاتا ہے۔ اور اپنی معاشرت کو قائم رکھنے کے لیے جدوجہد یا تحریکوں کے ذریعے ردعمل کا اظہار کیا جائے تو حکومتی احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو یا تو اٹھا لیا جاتا ہے یا پھر قتل کر دیا جاتا ہے۔ اسی ڈر اور اپنی سلامتی کے لیے عوام خاموش رہتی ہے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی افسانہ "لاوارث" ہے جو مقامی افراد پر مارشل لاء جیسی پابندی کے سلسلے میں ریاستی جبر و دہشت کی بھیانک کہانی ہے۔ سعد اللہ کہانی کا مرکزی کردار ہے جو ایک شام آفس سے گھر واپس نہیں لوٹتا۔ ڈھونڈنے اور معلوم کرنے پر بس اتنا قیاس سننے کو ملتا ہے کہ جو لوگ وطن دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہوں اُنھیں حکومت اُٹھا کر لے جاتی ہے۔ یہ قیاس آرائیاں بوڑھے والدین، بیوی بچوں کو کرب اور صدمے سے دوچار رکھتی ہیں۔ بنیادی طور پر اس افسانے میں ریاستی جبر کے ایک گھرانے اور معاشرے پر اثرات کو واضح دیکھا جاسکتا ہے کہ کس طرح افراد کے گھر اجڑتے ہیں، معاشرہ متاثر ہوتا ہے اور قانون نافذ کرنے والے ادارے کس طرح ریاستی جبر میں ملوث ہوتے ہیں۔

> "اللہ تعالیٰ اُن پر رحم کرے۔ معلوم نہیں یہ بچارے کہاں چلے گئے۔"

"بندو بابا یہ چلے نہیں گئے۔ اُنہیں اُٹھالیا گیا ہے۔"

"وہ کیسے"

"جو لوگ وطن دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہوتے ہیں حکومت اُن کو اٹھا کر لے جاتی ہے۔"

"ارے تم اخبار پڑھنے والوں کو ہر شخص وطن دشمن دکھائی دیتا ہے۔ یہ بچے، یہ جوان، کیا وطن دشمنی کریں گے؟"[۱۹]

اس ریاستی جبر میں پولیس کا کردار بھی آمرانہ اور غنڈہ گردی سے کم نہیں ہوتا کہ جس میں بے گناہ اور لاچار قیدیوں پر ظلم و ستم کیا جاتا ہے۔ اس افسانے "لاوارث" میں جاوید اختر بھٹی نے معاشرے کے اُن لوگوں کے حالات و واقعات کو بھی عکس بند کیا ہے جو غربت اور لاچاری میں پولیس گردی کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

"صبح ایک اہلکار نے آکر اطلاع دی کہ "سر ایک قیدی مردہ پڑا ہے" اُسے کچھ یاد آیا کہ رات اس نے ایک قیدی پر بے پناہ تشدّد کیا تھا۔ کہیں وہ مر نہ گیا ہو لیکن اُسے قیدی کا چہرہ یاد نہیں رہا تھا۔

"سر لاش کا کیا کریں؟"

"دریا میں پھنک دو۔"[۲۰]

اس کے بعد ایک اور افسانے "کوتوال پناہ" میں بھی یہی پولیس گردی کو قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ نچلے طبقے کے لوگ معمولی غلطی پر ملکان کی طرف سے پولیس کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں پھر ان نادار اور مجبور افراد کے گھر والے رہائی کے لیے پولیس کی من مانیاں پوری کرنے کے لیے کیسے کیسے غلط اور مکروہ کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس افسانے کی کہانی ایک عورت کے گرد گھومتی ہے جو اپنے خاوند کو رہا کرانے تھانے جاتی ہے جس کا مالک شہر کا رئیس ہونے کی حیثیت سے معمولی غلطی پر اُسے پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔

"میں تھانیدار کے پاس گئی کہ ہم غریب لوگ ہیں۔ ہم برباد ہو جائیں گے، ہم پر رحم کرو، ہماری مدد کرو، تھانیدار مجھے غور سے دیکھتا رہا اور پھر اس نے کہا تم اپنے خاوند کو بچا سکتی ہو۔ وہ رئیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں نے کہا وہ کیسے؟ اُس نے کہا وہ ایسے کہ تم میرے پاس رہو گی۔ کھانا پکا دینا، کپڑے دھو دینا اور بس۔"[۲۱]

ہماری معاشرتی برائیوں اور مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ رشوت ستانی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ لینے والوں کے ساتھ دینے والوں نے بھی اسے عادت یا رسم و رواج کی شکل دے رکھی ہے۔ اگر ایک کام جائز یا حلال طریقے سے ہونے میں کچھ وقت لے رہا

ہے تو اُسے جلد از جلد کروانے کے لیے رشوت دی جاتی ہے اس کی بڑی وجہ احکاماتِ الٰہی سے روگردانی اور اسلامی تعلیمات سے دوری ہے کہ جس سے ایسے معاشرتی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ زندگی کا ہر شعبہ سفارش، رشوت یا پھر اقرباء پروری کے زیر اثر دکھائی دیتا ہے اور انھی برائیوں کے باعث معاشرتی ابتری حد سے تجاوز کر گئی ہے۔ خاص طور پر رشوت ستانی کے بازار نے ہمارے حالاتِ زندگی اور طرزِ زندگی کو یکسر بدل دیا ہے۔ جاوید اختر بھٹی کے افسانوں میں اس معاشرتی برائی کی عکس بندی زندگی کے کسی ایک شعبے تک محدود نہیں ہے بلکہ کمال مہارت سے یہ بات سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ مقامی آدمی رشوت ستانی میں اس قدر پھنس چکا ہے کہ پیدائش سے لے کر موت تک اسے ضروری خیال کرتا ہے۔ ہر کام اور عمل اس کے بغیر ناممکن تصور کیا جاتا ہے۔ افسانہ "تصویریں" میں رشوت کے لیے تصویروں کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار "بشیر" ہے جب وہ پیدا ہوا تو پیدائش کے وقت بشیر کا والد ایک خیراتی ہسپتال گیا تاکہ بروقت کسی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کی جا سکیں۔ یہ کہانی اور رشوت کا سلسلہ پیدائش سے بھی پہلے شروع ہو گیا جب ڈیوٹی کا بہانہ کر کے لیڈی ڈاکٹر نے آنے سے انکار کر دیا۔

> "بشیر کے باپ نے اس کے سامنے، چند تصویریں رکھ دیں۔ اس کا سر احترام سے جھک گیا پھر وہ جواب نہ دے سکی اسے اپنے فرض کا احساس شدت سے ہونے لگا اس نے تصویریں اٹھا کر جیب میں رکھ لیں اور ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔"[۲۲]

رشوت لے کر ڈاکٹر نے نہ صرف اپنا ضمیر بلکہ ایمانداری بھی بیچ دی۔ یہ حقیقت ہے کہ آدمی ایک بار جب اپنے ضمیر اور ایمانداری سے محروم ہو جائے تو اس کے اندر سے وہ حِس یا احساسِ انسانیت جو اُسے اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا، اس عظمت و برتری کا احساس دلاتی ہے، وہ ختم ہو جاتی ہے اور انسان کو زندگی کے ہر میدان، معاملے اور ہر کام میں رشوت دینے اور لینے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اس افسانے میں بھی افسانہ نگار نے انسانی زندگی کا مکمل محور اسی رشوت کے زیر اثر دکھایا ہے کہ پیدائش کے بعد تعلیم و تربیت کے لیے سکول داخل کرانے کا وقت آیا تب اسی رشوت سے اچھے سکول میں جھٹ پٹ داخلہ مل گیا۔ پھر بچے کو اگلی جماعتوں میں ترقی دلوانے کے لیے اس کا باپ رشوت دیتا رہا۔ یوں بشیر نے میٹرک اور پھر گریجوائشن کی ڈگری حاصل کر لی۔ ملازمت کا وقت آیا تو انکم ٹیکس کی ایک آسامی کے لیے سو امیدوار تھے۔ یہاں بھی باپ نے ڈگری کے ساتھ پیسہ دکھایا تو ملازمت بیٹے کو مل گئی۔ جس بیٹے کی پیدائش سے لے کر تعلیم و تربیت کے ہر مرحلے اور ملازمت تک باپ نے اپنے دین، ایمان، اخلاقیات پر پیسے کو ترجیح دی اور عزت یا رشتوں کے تقدس کی بھی پرواہ نہ کی، اُس نے اپنے بیٹے کو ملازمت ہوتے نصیحت کی کہ اب رشوت دینے کا وقت ختم اور لینے کا وقت شروع ہو گیا ہے۔ جو ملازمت تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ شادی بھی امیر سیٹھ کی بیٹی سے کی جو جہیز میں بہت روپیہ پیسہ لائی۔ شادی کے بعد سسر سے مزید دولت لانے کے لالچ نے نوبت طلاق تک پہنچا دی تو بشیر نے اس وقت بھی سسر سے رشوت لے کر بیوی کو طلاق دی۔ اس کے بعد ایک من پسند لڑکی کو رشوت کے عوض خریدنا چاہا تو اس لڑکی نے اس کی

حرام کی کمائی دولت بشیر کے منہ پہ دے ماری۔ بشیر کو اپنی توہین تو محسوس نا ہوئی البتہ اپنے روپے پیسے کی توہین وہ برداشت نا کر سکا اور کار ایکسڈنٹ میں اس کی موت ہو گئی۔ بشیر کا باپ جس نے بشیر کی پیدائش سے لے کر تمام عمر رشوت دے کر بیٹے کو جوان کیا یہاں اس کی موت کے وقت بھی اس کے ذہین، سوچ اور دل پہ اللہ نے مہر ثبت کر دی۔

> "بشیر کو جب قبر میں اتار دیا گیا تو بشیر کے باپ نے تصویروں سے بھرا رومال اپنے ہاتھوں سے قبر میں رکھا۔ اور یہ کہہ کر باہر نکل آیا" شاید تجھے ان تصویروں کی ضرورت پڑے" اور پھر مٹی سے قبر بند کرنے لگا۔"[۲۳]

افسانہ نگار نے مقامی معاشرت اور معاشرتی برائیوں کے حوالے سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ رشوت ستانی نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کر رکھا ہے۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ اس قدر آزاد خیال ہیں کہ اُنھیں یہ معاشرتی بگاڑ محسوس نہیں ہوتا اور متوسط طبقہ اسے معاشرت کا حصہ بنا چکا ہے۔ نچلا طبقہ اس چکی میں پس کر ترقی بھی کر لے تو وہ بھی معاشرے کی چلتی روش کے مطابق، بشیر کی طرح دینے والے سے لینے والے بن جاتے ہیں مگر اسے ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

ایک اور اہم معاشرتی مسئلہ مقامی آدمی میں منشیات کی عادت کو افسانوں میں موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف ایک آدمی اور اُس کا گھر بار اُجڑتے ہیں بلکہ معاشرہ اور ملک و قوم کو بھی یہ لعنت تباہ کر دیتی ہے۔ مقامی آدمی اس عادت کا شکار ہو کر بے بس ہو گیا ہے اور بے بسی کی انتہا کچھ اس قدر ہے کہ ایسے نشئی افراد خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس سے نجات کی کوشش کے باوجود اس برائی سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتے۔ اس کی بنیادی وجہ غلط صحبت ہے اور دوسرا زندگی کی مشکلات، پریشانیاں انسان کی ذہنی بے سکونی اور بے چینی کا باعث ہوتی ہیں ایسے میں غلط سوسائٹی ذہنی سکون کے لیے نشے کا استعمال کرتی ہے۔ مشکلات اور پریشانیاں انسانی زندگی کا حصہ ہیں۔ ذہنی سکون بھی انسان کو چاہیے ہوتا ہے اس لیے جو لوگ اس سکون کی وجہ نشے کو سمجھ کر اس کی عادت ڈال لیتے ہیں پھر اُن کے لیے اس لت سے چھٹکارا حاصل کرنا کسی صورت ممکن نہیں ہوتا۔ دوسری بات نشے کا استعمال اس کی طلب بڑھاتا ہے۔ اسی طلب کو پورا کرنے کے لیے اپنی جمع پونجی، پیسہ، دولت سب لگا دیتا ہے جب سب ختم ہو جاتا تو پھر لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانا شروع کر دیتا ہے۔ یہ برائی انسان سے اس کی عزت، انا، رتبہ اور معاشرتی مقام چھین لیتی ہے اور اس کی طلب برے کام جیسے چوری وغیرہ کرنے پر اکساتی ہے۔ ایسی صورتحال میں عادی افراد کے گھر والے اُن کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کو افسانہ نگار نے اپنے افسانے "دھواں، رات اور آدمی" میں قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ مقامی آدمی کس طرح اس دلدل میں پھنستا ہے؟ اور کوشش کے باوجود اس سے نکل نہیں پاتا۔ اس افسانے میں متکلم کو فٹ پاتھ کے ایک بھکاری سے ہمدردی محسوس ہوتی ہے تو اُسے روٹی کھلانے کی پیشکش کرتا ہے۔ وہ بھکاری جو دراصل منشیات کا عادی شخص ہے وہ متکلم کی روٹی کی پیشکش، ہمدردی اور خلوص بھری باتوں کو جھٹک کر اُس سے ۲۰ روپے مانگتا ہے۔

CC BY

"روپے لے کر وہ دوسری سمت مزید تیزی سے چلنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں 'میں نے اسے ایک کونے میں بیٹھا دیکھا۔ جہاں غلاظت کا ڈھیر اور گہرا اندھیرا تھا وہاں آگ کا ایک معمولی سا شعلہ تھا اور دھواں تھا۔ اور ان کے درمیان وہ انتہائی مطمئن اور پر سکون دکھائی دے رہا تھا۔"[۲۴]

لفظ "نشہ" کے زبان پہ آتے ہی ذہن اور نگاہوں میں اس کی خرابیاں اور نتائج سامنے گھومنے لگتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اسے ایک صالح و صحت مند معاشرہ ہر گز قبول نہیں کرتا۔ دوسری طرف یہ لعنت جیسی برائی کسی بھی صالح اور صحت مند معاشرے کو آسانی سے تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ اچھے بھلے گھرانے کے افراد اپنی خوشگوار زندگی اس برائی کی وجہ سے تباہی کے دہانے تک لے آتے ہیں۔ اس کا آغاز بری سوسائٹی اور بری صحبت سے ہوتا ہے۔ نشے کی لت پڑ جانے کے بعد متاثرہ فرد کے لیے رشتوں کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے بلکہ اپنی خود کی ذات، عزت، انا، زندگی سب بے معنی اور غیر اہم لگتی ہے جب نشے کی طلب پوری نا ہونے پہ بدن ٹوٹتا ہے اور اس طلب کو پورا کرنے کے لیے ہر برا کام جیسے جھوٹ، چوری، ہاتھ پھیلانا سب کرنے لگ جاتا ہے۔ اس لیے انسان کو اچھی سوسائٹی میں اُٹھنا بیٹھنا اور اچھی صحبت اختیار کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ ملتان کی معاشرت میں آج بھی مختلف فٹ پاتھ پر ایسے افراد نظر آتے ہیں جو اس برائی کا شکار ہیں۔ ہر طبقہ اس سے متاثر ہے اور یہ ضروری نہیں کہ جہالت کی وجہ سے یا بے شعور افراد اس کا شکار ہوتے اور نا ہی صرف غریب۔ بلکہ اچھے بھلے، کھاتے پیتے گھرانے کے افراد اس لت میں پڑ جاتے اور معاشرے کی تباہی کا باعث بنتے۔ درج بالا افسانے میں بھی متاثرہ شخص ایک اچھے گھرانے کا فرد ہے۔

"اس کی ایک دکان تھی۔ گھر میں خوشحالی تھی۔ زندگی آرام سے گزر رہی تھی۔ اور پھر ایک دن اس کے دوست نے اسے سگریٹ دیا اور اس سگریٹ کی بات ہی کچھ اور تھی۔۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔۔ سبھی لوگ آئے۔ مجھے لے جاتے تھے۔ علاج کرواتے تھے۔ بیوی روتی تھی، منت سماجت کرتی تھی۔ بچوں کا واسطہ دیتی۔ میں قسم کھاتا کہ آئندہ اس زہر کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ اب میں پھر کاروبار کروں گا۔ گھر میں رہوں گا۔ اور پھر معلوم نہیں کیوں میں کبھی رات کے اندھیرے اور کبھی دن کے اُجالے میں، گھر سے نکل کر ان اجنبی لوگوں میں آجاتا ہوں۔"[۲۵]

ہمارے معاشرتی زندگی کا ایک اور پہلو توہم پرستی ہے جس نے معاشرے میں باقاعدہ ایک عقیدے کا روپ دھار لیا ہے۔ اس کی ایک وجہ جو سمجھ میں آتی ہے وہ سائنسی اور مادی ترقی ہے جس نے انسان کے ایمان اور عقیدے کو متزلزل کر دیا ہے اسی مادیت پرستی کے زیر اثر معاشرے کے اکثر گھرانوں کے افراد مختلف چیزوں، واقعات، اعمال اور علامات کو مقدس گردانتے ہیں اُن کی یہ توہم پرستی اُن کے خیالات و افکار پر منفی اثر ڈالتی ہے۔ حقیقت اور سچائی سے نظریں چُرا کر اور زندگی کی ضروریات اور آسائشوں کے لیے خُدا بزرگ و برتر سبحانہ و تعالیٰ پر توکل کرنے کے بجائے جعلی پیر و مرشد اور تعویز ٹونے پر یقین رکھتے ہیں۔ جاوید اختر بھٹی نے اپنی معاشرت کے اس پہلو کو افسانے "اندھیرے مستقبل کی بشارت"، "مسکن" اور "زندگی" میں سمویا ہے۔

"اندھیرے مستقبل کی بشارت" میں کہانی کا مرکزی کردار ایک عورت ہے جس کی چھے بیٹیاں ہیں اور اُس نے ساتویں بیٹی کو جنم دیا جس پر وہ غمگین ہے کہ بدصورت بیٹیاں اور وہ بھی سات۔ وہ ہر بار بچے کی پیدائش پر اللہ سے بیٹے کی آرزو کرتی تھی مگر اللہ اُسے بیٹی عطا کرتا۔ اب ساتویں بار بھی بیٹی پیدا ہوتی ہے تو وہ اللہ سے مایوس ہو جاتی ہے اور ایک پیر کے مزار پر اپنی مراد لے کر جاتی ہے۔

> "اب وہ اپنے خدا سے مایوس ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ "پیر مرادوں والے" کے مزار پر گئی۔ جہاں مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ جہاں سے وہ آٹھویں بشارت لینے آئی تھی۔ جس کا نام اس نے اپنے ذہین میں "روشن" تجویز کیا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ وہ "پیر مرادوں والے" کی قبر پر سجدہ کئے ہوئے مسلسل رو رہی تھی۔"[۲۶]

یہ ہمارے معاشرے کے کمزور ایمان لوگوں کی عکاسی کی گئی ہے جو اس بات کا علم و شعور بھی رکھتے کہ عزت، دولت، شہرت کے ساتھ اولاد بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے پھر بھی اُس کے آگے جھکنے اور مانگنے سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے افراد جو بغیر سوچے سمجھے اور صرف تقلیدی عقیدے کی بنا پر بیعت ہو کر مرید بن جاتے۔ دراصل ہماری معاشرت یعنی افسانہ نگار کی مقامی معاشرت میں دیہاتی طرزِ زندگی میں تقلیدی عقیدے پر چلنے والی روش عام ہے۔ اور اسے جعلی پیروں نے کاروبار بنا رکھا ہے۔ افسانہ "زندگی" میں افسانہ نگار نے اس کی عکاسی کی ہے کہ عام آدمی ایک جعلی پیر کے متعلق جانتا ہے کہ وہ دھوکے باز اور جھوٹا ہے مگر پھر بھی دوسروں کی تقلید کرتے ہوئے اپنے عقیدے کو بیچ دیتے ہیں:

> "میں نے اس کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا۔ "تم یہاں کیا کرنے آئے ہو۔ یہ دھوکے باز ہے۔ جھوٹ بولتا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ آوارہ آدمی کی دعا سے تمہارے کام ہو جائیں گے۔ کیا دے گا، یہ شخص تمہیں کیا دے سکتا ہے؟" ایک آدمی نے کہا "یہ بہت کچھ دے سکتا ہے۔ اس نے مجھے زندگی دی ہے۔ میں مر گیا تھا۔ اس نے مجھے زندہ کر دیا۔" اس بوڑھے آوارہ نے کہا۔ "اگر تم مر جاؤ تو میں تمہیں زندہ کر دوں گا۔" اس کا ایک مرید میری جان لینے کیلئے آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ میں نے اس بوڑھے آوارہ سے زندگی کی بھیک مانگی۔ اس نے مجھے بھیک دے دی۔ اب میں بھی اس کے مریدوں میں شامل ہوں۔ کیونکہ باباجی نے مجھے زندہ کر دیا۔"[۲۷]

اِس کے علاوہ جعلی پیر، فقیر، عامل اور نجومی عام آدمی کے سامنے کسی جن بھوت کے اپنے قابو میں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اُن کی مدد سے دولت، محبت کا حصول اور زندگی کے باقی مختلف مسائل حل کرانے کا دعویٰ کر کے عوام کو بے وقوف بناتے ہیں۔ افسانہ نگار نے اپنی معاشرت کے اس پہلو پر افسانہ "مسکن" میں تنقید کی ہے کہ ہوٹل میں بیٹھا ایک شخص عام آدمی کے سامنے جن کو قید کرنے کا دعویٰ کر کے خوف پھیلاتا ہے اور خود کو جن کا عامل ظاہر کرتا ہے اور دوسرے آدمی اس کا یقین بھی کر لیتے ہیں۔ وہ شخص جن کو بوتل میں قید کرنے، اُنھیں جلا کر راکھ کرنے اور پھر اس راکھ پر پانی ڈال کر اُنجنات کو دوبارہ زندہ کرنے کی

اپنی کہانیاں سناتا ہے اس طرح کی باتیں کر کے وہ وہاں بیٹھے دوسرے آدمی کو خوف زدہ کر دیتا ہے۔ وہ اُٹھ کر جانے لگتا ہے تو اُسے ڈراتا ہے کہ اگر تم یہاں سے اُٹھ کر گئے تو میرے جنا تمہیں قتل کر دیں گے۔ اپنی چائے کے پیسے بھی اسی دوسرے آدمی سے دلواتا ہے۔

"وہ رک گیا اور پھر اس نے کہا۔ "تم نے چائے کے پیسے دے دیئے ہیں؟" میں نے کہا "نہیں۔" اس نے کہا، "میرے پیسے بھی تم دو گے"۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے" میں نے دوبارہ گفتگو شروع کی۔ "آپ دنیا پر حکومت کیوں نہیں کرتے؟" اس نے کہا۔ "اے لالچی انسان مجھے تم سے یہی امید تھی۔ تم مجھ سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو۔ حکومت کرنا احمقوں کا حق ہے، لالچی لوگوں کی خواہش ہے۔ میری نہیں۔ ہاں تمہارا کوئی کام ہے تو بتاؤ، میں کسی جن سے کہوں گا وہ کر دے گا۔"[۲۸]

اکیسویں صدی میں سائنس کی ترقی نے انسانی زندگی میں بے شمار آسانیاں پیدا کی ہیں۔ سائنس کی ترقی سے نت نئی ایجادات ہوئیں جن میں سے ایک موبائل فون ہے۔ موبائل فون کی ایجاد سے جہاں انسانی زندگی میں رابطے اور ابلاغ میں آسانی پیدا ہوئی ہے وہاں پورا معاشرہ اس موبائل فون کے ہاتھوں یرغمال بنا نظر آتا ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ہر عمر کے افراد اس موبائل فوبیا کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس پہلو کی عکس بندی افسانہ "فضل دین کا موبائل فون" میں خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار بوڑھا فضل دین ہے جس کی عمر پینسٹھ سال ہے۔ یہ کہانی افسانہ نگار نے ۲۰۱۶ میں لکھی مگر یہ آج کے معاشرے کی بھی عین عکاسی کرتی ہے۔ فضل دین ملازمت سے ریٹائر ہوا تو وقت گزاری کے لیے باہر ہوٹلوں میں نوجوان نسل کی لگنے والی محفلوں میں بیٹھنے لگا۔ نوجوان نسل جدید اور آج کے زمانے کی باتیں کرتے تھے جبکہ فضل دین پرانے زمانے کا آدمی تھا۔ نئے زمانے کے لوگوں کے ساتھ تعلق، محفلوں میں بیٹھنے اور ان کے علاوہ بھی نوجوان نسل سے رابطے اور گپ شپ کے لیے بازار سے ایک موبائل فون خرید لایا جو اپنی بیوی کی بالیاں بیچ کر خریدا۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اب جہاں بیٹھتا، تھوڑی سی گفتگو کے بعد کسی نوجوان سے موبائل فون کا نمبر پوچھتا اور اپنے فون میں فیڈ کرتا اور بیل دیتا۔ دونوں طرف سے مسکراہٹ کا تبادلہ ہوتا۔ کبھی کبھی وہ کسی نمبر پر فون کر کے خیریت دریافت کرتا۔"[۲۹]

اس معاشرتی مسئلے کی طرف توجہ دلانے کے لیے یہ کہانی افسانہ نگار کی دور اندیشی اور سماجی شعور کا کمال ہے کہ بوڑھے فضل دین جیسے کردار کی صورت میں ہمارے معاشرے کی حقیقت ہمارے سامنے لا کھڑی کی ہے۔ موبائل فون ایک ایسی چیز ہے اسے جب انسان سیکھ کر پوری طرح ایک بار چلا لے، استعمال کر لے تو اس کے بعد بے شک موبائل ٹھیک ٹھاک چلتا رہے مگر شوقین افراد اسے بدلنے اور اس سے اور زیادہ اچھا موبائل فون لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس افسانے میں بھی بوڑھے فضل دین کو نیا اور پرانے سے اچھا موبائل لینے کا شوق پیدا ہو گیا۔ اس نے بیوی کی انگوٹھی بیچ کر نیا موبائل فون خرید لیا۔ جو کہ اس کی بیمار بیوی

کا آخری زیور تھا جسے اس نے اپنی بیماری میں علاج کے اخراجات کے لیے بھی نہیں بیچا تھا۔ اس انگوٹھی کی چوری کا الزام اس کی بہوؤں پر لگتا ہے۔ یہاں ہم اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ موبائل فوبیا جیسی معاشرتی برائی رشتوں میں اعتماد، اعتبار کو کیسے ختم کر دیتی ہے اور چھوٹے بڑے جرائم میں کیسے کردار ادا کرتی ہے اسی وجہ سے معاشرے کی اخلاقی اقدار متاثر ہوتی ہیں۔ دراصل مقامی آدمی نے اسے اشد ضرورت کا درجہ دے دیا ہے اور ہر جگہ اسے ساتھ رکھنا اور اس کا استعمال ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ افسانہ "فضل دین کا موبائل فون" میں بھی فضل دین کا حال کچھ ایسا ہی ہے کہ بیوی کی وفات پر بھی اس کی توجہ موبائل کی طرف ہے ۔کسی قسم کے دکھ، پریشانیا غم کے آثار نہیں ہیں بلکہ اللہ کی مرضی کہہ کر تعزیت کرنے والوں سے جان چھڑا رہا ہے۔ موبائل فون نے اس کے دل، دماغ اور ضمیر کو جکڑ رکھا ہے۔ دورانِ سفر فضل دین کا موبائل گم جاتا ہے تو اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے وہ بس میں موجود ہر مسافر کی تلاشی لیتا ہے اور نا ملنے پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔

"فضل دین بس سے اتر گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دوستوں نے کہا "فضل دین اس طرح تو اپنی بیوی کی موت پر بھی نہیں رویا تھا۔" اس کی بہوؤں نے کھانے کا پوچھا تو اس نے انکار کر دیا۔ فضل دین جب اپنی بیوی کو دفن کر کے آیا تھا تو اس نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا تھا۔ اس کی بیوی کی موت پر تو افسوس کیا جا سکتا تھا۔ جس کا فضل دین نے کبھی تقاضا نہیں کیا تھا۔ موبائل فون کے گم ہونے پر کون افسوس کرے لیکن فضل دین کی خواہش تھی کہ دوست اس کا ذکر کریں اور وہ اپنے گم ہو جانے والے "دوست" کی خوبیاں بیان کرے۔"[۳۰]

۲۰۱۸ء میں جرمنی کے شہر ہیمبرگ میں موبائل فون کے کثرت استعمال کے خلاف ایک ریلی نکالی گئی جس کی خاص بات یہ تھی کہ وہ ریلی دس سے سترہ سال کے بچوں نے اپنے والدین کے خلاف نکالی۔ اور احتجاج کیا کہ ہمارے والدین ہمیں اتنا وقت نہیں دیتے جتنا وقت وہ موبائل استعمال کرتے ہیں۔ افسانہ نگار نے درج بالا افسانے میں اس مسلے کی واضح عکس بندی کی ہے کہ موبائل فوبیا سے رشتوں کی پہچان، احترام اور تقدس ختم ہو جاتا ہے اور آپس کے تعلقات میں مضبوطی کے بجائے دراڑیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ فضل دین بھی موبائل فوبیا کا شکار ہو کر موبائل فون کا کاروبار شروع کرنے کا سوچتا ہے مگر کاروبار کے لیے رقم یا پیسہ نا ہونے کے باعث اپنے بیٹوں کو گھر خالی کرنے کا کہتا ہے تا کہ گھر بیچ کر کاروبار کر سکے۔ خاندان کے بزرگوں نے بیٹوں کو دربدر کرنے سے روکنے کے لیے سمجھایا تو فضل دین نے بیٹوں سے پندرہ ہزار والا موبائل فون اور پھر ہر ماہ بیلنس کارڈ لے کر دینے کی شرط رکھی۔ اس مسلے کو سلجھانے کے لیے کسی سیانے نے اپنی جیب سے سات، آٹھ ہزار والا موبائل نکال کے فضل دین کے ہاتھ پہ رکھا تو وہ موبائل میں مگن ہو کر سارا معاملہ ایک طرف رکھ دیا۔

افسانہ نگار نے اسی طرح کے معاشرتی مسائل اور برائیوں کے مقامیت پر منفی اثرات کو قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے کیونکہ ان اثرات سے مقامی زندگی اور مقامی معاشرے کی بنیادی اخلاقیات متاثر ہو رہی ہیں اور معاشرتی رشتوں کے

درمیان منفی سماجی رویے جنم لے رہے ہیں۔ افسانہ "آئی ایم سوری" میں موبائل فون کے غلط استعمال کے کلچر کو عکس بند کیا گیا ہے کہ فارغ اوقات میں کوئی بھی نمبر ملا کر گپ شپ لگانا، دوستی کرنے کی کوشش کرنا ہمارے معاشرے کے کچھ مخصوص لوگوں کا وطیرہ ہے جو بلخصوص خواتین کے ساتھ ٹیلی فون پر زبانی لذت اور ذہنی آسودگی کے شوقین ہوتے ہیں۔ ابتداء ہیلو، ہائے، سلام و دعا سے کر کے، بات کو روزمرہ عمومی گفتگو، گپ شپ اور فضول باتوں سے میل ملاقات تک تعلق بڑھا لیتے ہیں۔

"ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔

ہیلو!

ہیلو!

کون صاحب ہیں آپ؟

میں رشید ہوں۔

میرا مطلب ہے کس سے بات کرنا چاہتے ہیں؟

آپ سے۔

سنو

جی جی _____ فرمایئے

ٹیلی فون اور بکواس دونوں بند کرو سمجھے (اور لڑکی ٹیلیفون بند کر دیتی ہے)"[۳۱]

انسانی زندگی اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس ساتھ کی بنیادی وجہ در حقیقت انسانی معاشرت ہے جس میں انسان کے روزمرہ کے حالات و واقعات، پیچ و خم، بقائے حیات کی کشمکش اور تقاضے شامل ہیں جو تخلیق ادب میں مطلوبہ مواد اور موضوعات فراہم کرتے ہیں۔ اُن تقاضوں میں نفسیاتی لحاظ سے ذہنی آسودگی، جنسی جبلت، جنسی جذبات و جبلت کی تسکین ایک فطری تقاضا ہے۔ معاشرے میں پائے جانے والے جنسی مسائل، نفسیاتی انتشار، جنسی واقعات اور جنسی گھٹن کو لکھنے والوں نے موضوع بنا کر ادب تخلیق کیا۔ جنسی موضوعات پہ تخلیقات کا مقصد تخلیق کار اور قاری دونوں کی لطف اندوزی ہوتا یا پھر سماجی مسائل کی مد میں اس کو موضوع بنا کے عکس بند کیا جاتا ہے۔ جیسے جاوید اختر بھٹی کے افسانوں میں جنسی مسائل کی پیشکش سماج کے حوالے سے ہے وہ سماجی مسلے کے طور پر اسے قاری کے سامنے لائے ہیں تا کہ ان مسائل کے حل تلاش کرنے کے ساتھ جنسی حوالے سے معاشرے کی سوچ بھی بدلی جا سکے۔ افسانہ "گندم کا عریاں دانہ"، "تلاش"، "ربی ذات"، "سرخ ڈوپٹہ" اور "مغلانی" میں جنسی حوالے سے

مقامی آدمی کو درپیشحالات،واقعات اور مسائل کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانہ "گندم کا عریاں دانہ" میں کہانی کا مرکزی کردار ایک گونگی عورت ہے۔ گونگی کا گھر،مال،مویشی سب کچھ جنگ کے دنوں میں اُجڑ جاتا ہے۔ پیٹ پالنے کے لیے ایک گھر میں کام والی کے طور پہ ملازمت کرتی ہے۔ مالکن کا شوہر گونگی پہ مہربان ہے تبھی مالکن گونگی کو ملازمت سے نکال دیتی ہے۔ اس کے بعد گونگی سڑکوں اور گلیوں میں رہنے لگتی ہے۔ لوگ اسے بری نظر سے دیکھتے ہیں مگر گونگی اپنے بدن پہ پہرہ دے رہی ہے۔ قریب بسوں کا ایک اڈا ہے وہاں سے آتے جاتے ڈرائیور گونگی کو آنکھ مارتے ہیں اور گونگی ان آنکھ مارنے والے ڈرائیوروں کو پتھر مارتی ہے اور جب اس کے پاس اکھٹے کیے پتھر ختم ہو جاتے ہیں تو رونے لگتی ہے۔ افسانہ نگار نے یہاں مختلف جنسی واقعات سے سماج کی بے حسی،ایکلاچار،مفلس اور بے گھر عورت کے ساتھ جنسی اذیت کو عکس بند کیا ہے تاکہ معاشرہ مفلس اور نادار عورتوں کے متعلق اپنی سوچ کو بدلے۔ ایسی عورتیں حالات اور واقعات کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہیں۔ اُنھیں روٹی،کپڑا اور چھت مہیا کرنے کے بجائے اُن کی مجبوری کا فائدہ اُٹھانا ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔ ایک رات تیز بارش میں گونگی نے سر ڈھانپنے اور سردی سے بچنے کے لیے قریب کے ہر گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر تمام دروازے بند رہے اور اپنی عزت پہ پہرہ دینے والی گونگی نے مجبوری اور لاچاری میں اپنی آبرو بیچ دی۔ تیز بارش سے بچنے کے لیے اُن ڈرائیوروں کے مکان میں پناہ لی جن کی بری نظر کا جواب پتھر سے دیا کرتی تھی۔ اس افسانے میں جنسی استحصال کے حوالے سے گونگی پر ہونے والے ظلم کا احساس لکھنے والے پر شدت سے حاوی دکھائی دیتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کہانی میں افسانہ نگار نے جنسی فضا میں،عورت کے جنسی استحصال کے ساتھ سماجی رویوں کی بے حسی کو بھی ابھارا ہے۔ اس مسئلے کو افسانہ "تلاش" میں بھی پرویا ہے۔ افسانہ "تلاش کا مرکزی کردار بھی ایک عورت ہے۔ افسانے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک عورت اپنے جوان بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ ذہنی حالت ایسی ہے کہ اسے دورے پڑتے ہیں جس میں اُسے ہر نوجوان اپنا بیٹا محسوس ہوتا ہے۔ عورت ذات کی یہ فطری نفسیات ہے کہ وہ شام اور رات ہوتے جب فارغ ہوتی تو اُسے اپنے دُکھ،غم یاد آتے۔ رات کے اندھیرے میں وہ لازماً اپنے بچھڑوں کو یاد کرتی ہے۔ افسانہ "تلاش" کی عورت کے ساتھ بھی کچھ ایسا معاملہ ہے۔ ایک شام وہ چہل قدمی کے لیے باہر نکلتی ہے تو قریبی پارک میں بیٹھ جاتی ہے۔ وہاں ہر جوان میں اُسے اپنے بیٹے کا عکس دکھائی دیتا ہے تبھی وہ ہر آنے جانے والے نوجوان کو تک رہی ہے۔ مشرقی عورت ہونے کے ناطے وہ کالے برقعے میں اور مکمل پردے میں ہے کہ دیکھنے والا اُس کے گورے ہاتھ پاؤں دیکھ کر اُسے جھریوں والی غمزدہ عورت نہیں سمجھ سکتا۔ افسانہ نگار نے یہاں عورت کے حوالے سے معاشرے کی روایت کو یوں لکھا ہے:

"چھوٹے شہروں میں پارک ضرور ہوتے ہیں لیکن کبھی کوئی اکیلی عورت پارک میں اکیلی نہیں آتی۔ جو آتی ہے معاشرہ اسے عورت نہیں کہتا،اس نے اس عورت نما کو بہت سے نام دے رکھے ہیں معاشرے نے اُس کے اندر کی عورت کو قتل کر دیا ہے اور اس نے عورت سے اس کا عورت پن چھین کر اسے کنجری، ٹیکسی اور حرافہ جیسے بہت سے روپ دے دیئے، ہمارے بھائی، بیٹے اور شرفا ان کے ساتھ بے شمار رنگین راتیں بسر کرتے ہیں، بعض بلکہ اکثر سیٹھ مستقل داشتائیں رکھتے ہیں ہر رات گرم ہوتی ہے، ہر

رات رنگین ہوتی ہے، ہر رات خوبصورت ہوتی ہے اور وہ ہر رات لٹتی ہے۔ ہر رات اندر کی عورت کو قتل کیا جاتا ہے اور باہر کی عورت کو لوٹا جاتا ہے، کبھی معاشرے کا کوئی مرد خود پر الزام نہیں ٹھہراتا، لوٹنے والوں کو تختہ دار پہ نہیں چڑھایا جاتا۔ بلکہ صرف اور صرف لٹنے والے کے مقدر میں صلیب ہے۔"[۳۲]

ایک بزرگ پارک میں اپنے تمام خاندان سمیت تفریح کے لیے آئے۔ اُس عورت کو پارک میں اکیلا بیٹھا دیکھا تو اُن بزرگ نے اپنی زندگی کے تجربات کی روشنی میں فوراً پہچان لیا کہ یہ معاشرے کی بدکار عورت ہے جس نے نہ صرف معاشرے کے ہر مرد کو خراب کر رکھا ہے بلکہ اس کی وجہ سے معاشرے کے ہر شریف گھر کی عورت بدنام ہے۔ بزرگ یہ سوچ کر اپنی بیٹیوں، پوتیوں، نواسیوں سمیت پورے خاندان کو وہاں سے لے کر چلے گئے کہ یہاں اس عورت کی موجودگی میں ایک شریف آدمی کیسے اپنے خاندان سمیت بیٹھ سکتا ہے۔ مگر چند دیہاتی اکیلے مرد اُس عورت کے گرد منڈلانے لگے ہوس ان کے اندر سر اُٹھانے لگی۔ وہ عورت کافی دیر بیٹھنے کے بعد اُٹھ کر گھر جانے لگی تو وہ مرد اس کے پیچھے چلنے لگے۔ ہر مرد اسے بدکردار اور فاحشہ سمجھ رہا تھا کیونکہ وہ رات کے وقت پارک میں اکیلی بیٹھی تھی اور ہر نوجوان کو تک رہی تھی۔ برقع کے اندر سے اُس کے چہرے پہ جھریاں، غم اور ممتا دیکھے بنا معاشرے کے ناسور مردوں نے اسے جسم فروشی کا دھندا کرنے والی عورت سمجھا۔ عورت نے اپنے پیچھے آتے، چلتے مردوں کو رک کر دیکھا تو اُسے "سگنل" سمجھا گیا۔ یہ کہانی آگے جا کر اور رخ اختیار کر گئی مگر یہاں معاشرے کی سوچ اور عورت ذات کے حوالے سے معاشرے کے جس رویے کو بیان کیا گیا ہے وہ قابل افسوس ہے اس کے علاوہ اسی کہانی میں معاشرے کے بدکردار مردوں کے متعلق اقتباس ملاحظہ ہو:

"مردوں کی عادت ہے کہ جب وہ کسی بدکردار عورت سے گناہ کرنے لگتے ہیں تو پہلے اس کی کہانی سنتے ہیں کہ وہ کس طرح اس "دلدل" میں پھنسی، اس لیے ہر ایسی عورت کو کوئی نا کوئی درد بھری کہانی ضرور یاد ہو گی۔ خواہ اس نے شوقیہ ہی پیشہ کرنا پسند کیا ہو۔ وہ کہانی سن کر اس سے ہمدردی کرتا، جتلاتا ہے، تسلی دیتا ہے، پھر گناہ کرتا ہے۔"[۳۳]

جاوید اختر بھٹی اپنی مقامی معاشرت کے جنسی مسائل کو افسانوں میں اس طرح موضوع بنایا ہے جس طرح کوئی طبیب مرض کی تشخیص کرنے اور پھر علاج کرنے میں عار محسوس نہیں کرتا اور نہ ہی علاج کی آڑ میں اپنی کوئی نفسانی خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ افسانہ "ربی ذات" اس حوالے سے ایک شاہکار افسانہ ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار دو عورتیں "ماں اور بیٹی" ہیں۔ دونوں طلاق شدہ اور دھندہ کرنے والی عورتیں ہیں اور بازاری زندگی بسر کر رہی ہیں۔ دن کے اُجالے میں شرافت کا لبادہ اُوڑھے معاشرے کے بدکردار مرد، رات کے اندھیرے میں ان ماں بیٹی سے جنسی تسکین جیسا فائدہ اُٹھاتے ہیں مگر شادی کرنے کے لیے کوئی راضی نہیں ہوتا۔ اپنا پیٹ پالنے کے لیے جسم فروشی کا دھندا کرنے پہ مجبور ہیں۔ ماں بوڑھی ہے مگر بیٹی جوان ہے اور گھر بسانے کے لیے فکر مند ہے کہ خاوند کے بغیر زندگی کا سفر مشکل کٹے گا یعنی معاشی فکر کے ساتھ سماجی تحفظ بھی عورت کی

بنیادی ضرورت ہے اور پھر جنسی آسودگی کی عدم دستیابی بھی دھندا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور جنسی آسودگی کے لیے شادی کرنا، جس کے لیے دستیاب رشتے صرف نشئی افراد کے ہیں جن کے ساتھ شادی کرنے کا مطلب ان کا بھی بوجھ اُٹھانا، انھیں کما کر کھلانا ہے۔ ایسے میں ماں بیٹی کو مشورہ دیتی ہے:

"دفع ہو جا' شادی کر لے' کسی کے ساتھ نکل جا۔ تیری وجہ سے میں نے چوتھی بستی کو چھوڑا ہے۔"

"کس کے ساتھ کر لوں۔ کون کرے گا مجھ سے شادی؟ کس کے ساتھ نکل جاؤں؟ بس یونہی زندگی بسر ہو گی۔ یونہی دال روٹی چلے گی۔ اس بستی میں نہ رہنے دیا گیا تو کہیں اور چلے جائیں گے۔ اس دھرتی پر اور بہت سی بستیاں ہیں۔"

ایک عورت جو کہ جوان تھی' اسے کوئی لینے آ گیا' وہ چلی گئی۔ ایک عورت جو کہ بوڑھی تھی' گھر پر پڑی رہی۔ اس لئے نہیں کہ وہ گھر کی حفاظت کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے کہ گھر سے باہر اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔"[۳۴]

جاوید اختر بھٹی نے معاشرے میں جنسی مسائل کا شکار ہونے والے افراد کی جنسی بے راہ روی کا ذمہ دار معاشرے اور معاشرتی رویوں کو ٹھہرایا ہے بلخصوص انفرادیت پسندی کے جنسی مسائل سماجی رویوں کے تناظر میں جنم لیتے ہیں۔ معاشرے کے شریف لوگ جو رات کے اندھیرے میں پاپی بن کر دھندا کرنے والی جسم فروش عورتوں سے جنسی تسکین حاصل کرتے ہیں وہ دن کے اجالے میں انھی عورتوں کو اپنے پاک علاقے اور معاشرے میں برداشت نہیں کرتے۔ درحقیقت یہ معاشرے کے منافقانہ لوگوں کا روپ و رویہ ہے دوسری طرف جنسی بے راہ روی میں ملوث عورتیں معاشرتی اور معاشی لحاظ سے ستائی ہوئی ہوتی ہیں۔ اکثریت کا تعلق کچی آبادی میں مقیم غریب خاندانوں سے ہوتا ہے۔ وہ ذہنی آسودگی یا لطف اندوزی کے لیے جنسی عمل کو نہیں اپناتیں بلکہ پیٹ پالنے اور سانسوں کے تسلسل کو جاری رکھنے کے لیے ایک پیشے کے طور پہ اپناتی ہیں۔

"ایک دن میرے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ اس کی ایک معشوق ہے "ریٹ" مناسب ہے اور سودا کھرا _____ میں اتنا بھی پرہیز گار نہ تھا۔ جوانی میں تو پرہیز گار بھی بھٹک جاتے ہیں اور میں _____ وہ مجھے کچی بستی میں لے گیا۔ وہاں سبھی مکانوں کی دیواریں کچی اور شکستہ تھیں جس مکان میں اس کی "معشوق" رہتی تھی۔ اس کی دیواریں اوروں سے بھی زیادہ شکستہ تھیں۔ دروازے پر دستک دی تو ایک بوڑھی عورت باہر آئی۔ وہ میرے دوست کو جانتی تھی۔ بولی "اچھا کیا تم آ گئے۔ ورنہ وہ جانے والی تھی۔ پھر کاروباری انداز میں بولی دونوں جاؤ گے تو پچاس روپے ہوں گے۔ میرے دوست نے پچاس روپے کا نوٹ بوڑھی عورت کے ہاتھ پہ رکھ دیا ہم اندر چلے گئے۔ میرے دوست نے کہا "تم برآمدے میں بیٹھو پہلے میں جاتا ہوں" _____ اور وہ کمرے میں چلا گیا۔"[۳۵]

دوسری طرف معاشرے میں جنسی جبلت کی شدت میں لپٹے جنسی مسائل کو افسانہ نگار نے مقامی آدمی کی جنسی خباثت اور مکاری کے ساتھ ننگا نہیں کیا ہے بلکہ معاشرتی رویوں میں ان مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ سماجی پس منظر

میں جنسی مسائل کو اعتدال کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے معاشرتی اخلاقیات بھی مجروح نہیں ہوئیں اور جنسی رجحان کی لاج بھی برقرار رکھی ہے۔

جاوید اختر بھٹی نے بیشتر افسانوں میں معاشرے کے مزدور طبقے، جفاکش، مفلس اور نادار لوگوں کی بات کی ہے یعنی عام آدمی کے مسائل اور واقعات کو موضوع بنایا ہے۔ دراصل ہمارے معاشرے میں پیسہ اور دولت نے برتری کے اعلیٰ معیار پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ جس کے پاس پیسہ، دولت ہے تو بھلے عزت، رشتوں کا تقدس، اخلاقیات نہیں ہے۔ برائیاں، جسمانی عیب، سب پیسہ و دولت سے چھپ جاتا ہے۔ مادی اشیاء کی اہمیت اور مادیت پرستی کی وجہ سے انسانیت کا احساس پامال ہو چکا ہے۔ معاشرے میں طبقاتی استحصال اسی وجہ سے ہے کہ پیسہ اور دولت نے انسان کے معیار زندگی قائم کر دیئے ہیں۔ جاوید اختر بھٹی اپنے افسانوں میں طبقاتی استحصال کی وجہ دولت یعنی کرنسی نوٹ کو گردانتے ہیں۔ دولت ایسی چیز ہے جس کے سامنے بڑی ڈگریاں اور سندیں بے داغ پڑی رہتی ہیں اور معاشرے کا ہر صاحبِ عقل نوٹ کو ہی اہمیت دیتا ہے چاہے نوٹ میلا کچلا ہی کیوں نہ ہو۔ نوٹوں میں طبقاتی کشمکش نہیں پائی جاتی کہ یہ نچلے طبقے کا نوٹ ہے، یہ میلا کچلا ہے، یا پھر اسے کوئی جمعدار یا ملازم دے گیا، نجانے یہ کہاں کہاں اور کس کسکے ہاتھ میں رہا؟ جیسا بھی ہے، نوٹ ہر حال میں برتری رکھتا ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں کسی کو دیتے وقت ہر انسان صاف اور نیا نوٹ اپنے پاس رکھتا ہے اور پرانا و میلا نوٹ دینے والے کو دیتا ہے۔ افسانہ نگار مقامی معاشرت کے اس پہلو کو اس طرح سے بیان کرتا ہے:

"یہ بات آج تک میری سمجھ نہ آسکی کہ جب بھی کوئی امیر کسی غریب کو مزدوری دیتا ہے تو وہ نئے نوٹ اپنے پاس کیوں رکھ لیتا ہے اور اس کی مزدوری کے عوض اسے میلے کچیلے نوٹوں سے کیوں نوازتا ہے؟ شاید اس لیئے کہ وہ غریب کے گندے لباس میں میلے نوٹوں کو پسند کرتا ہے اور اپنے بیداغ قیمتی لباس میں صاف ستھرے اور نئے نوٹ رکھنا ہی پسند کرتا ہے، یا شاید وہ غریب کو اس کی کمتری کا احساس شدت سے دلانا چاہتا ہے۔"[۳۶]

درج بالا اقتباس افسانہ "آخری نوٹ" سے لیا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار متکلم کی صورت میں خود افسانہ نگار ہے۔ جو تپ دق کے مرض میں مبتلا ہے اور علاج کے لیے تمام جمع پونجی اور پھر بیوی کے زیورات بھی بیچ ڈالنے کے بعد، سب کچھ لٹانے کے بعد اس کے پاس سو کا آخری نوٹ بچا ہے جو ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے فیس اور دواؤں پہ خرچ کرنا ہے۔ فی الوقت اس آخری نوٹ کی موجودگی میں وہ خود کو اس قدر امیر تصور کر رہا ہے کہ وہ چاہے تو اس سو روپے سے کسی بائی کے کوٹھے پہ جا سکتا ہے، کسی مجبور لڑکی کے ساتھ رات گزار سکتا ہے، شراب کی سالم بوتل بھی خرید سکتا ہے (یہ کہانی ستر کی دہائی میں لکھی گئی اُس وقت شراب کی بوتل کی قیمت سو روپے سے کم تھی) اور دوسری طرف متکلم اپنی خوبصورت بیوی کو دیکھتا ہے جس کی خوبصورتی شادی کے بعد مفلسی اور غربت کی بھینٹ چڑھ گئی اور فاقہ کشی نے اسے بے جان مورت بنا دیا ہے۔ جاوید اختر بھٹی لکھتے ہیں:

"غریب کی قسمت میں خوبصورت بیوی اور دولت کا یکجا لکھا جانا فلم کی دنیا تک ہے اس سے باہر کی دنیا کچھ اور ہے"[۳۷]

ایک غریب، مفلس اور بیمار مرد کے جذبات اور سوچ کی عمدہ عکس بندی کی گئی ہے کہ حالات، مسائل اور پھر بیماری میں مقامی آدمی اپنے لیے، اپنی بیوی اور گھر کے لیے کس قدر پریشان حال اور کیا جذبات رکھتا ہے؟ بنیادی طور پر متکلم اپنی کہانی طبقاتی استحصال کی زد میں بیان کرتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں اور رویے معاشرے میں امیر اور غریب کے درمیان فرق کا بیج بوتے ہیں۔ امیر شراب پیئے تو کچھ نہیں ہوتا اور غریب شراب پیئے تو اسے تپ دق جیسے مرض گھیر لیتے ہیں۔ ہسپتال جائے تو داخل نہیں کیا جاتا یا پھر خالی بستر نہیں ملتا۔ جبکہ امیر یا رئیس کے لیے ہمیشہ الگ کمرہ خالی ہوتا ہے۔ اگر نہ بھی ہو تو ڈاکٹر اپنا آفس خالی کر دیتے یا پھر کوئی کمرۂ جماعت خالی کر کے بستر لگا دیا جاتا ہے۔ یہ سب بھی ممکن نا ہو تو بھرے وارڈ میں پردے لگا کر الگ کمرہ بنا دیا جاتا ہے تاکہ مریضوں سے بھرے وارڈ میں بھی طبقاتی انفرادیت قائم رہے۔ اعلیٰ طبقے کے مریضوں کے لیے آب و ہوا، کام اور خصوصاً خوراک و غذا کی پرہیز ضروری ہوتی۔ امیر مریضوں کے لیے ہسپتال میں پرہیزی کھانے تیار ہوتے ہیں۔ ملاقات کرنے کے لیے ہر وقت دوست، احباب، رشتے دار جمع رہتے ہیں۔ ڈاکٹر کو منع کرنا پڑتا ہے کہ مریض کا آرام کرنے دیں۔ خدانخواستہ مریض مر جائے تو اس کی موت کو ناقابلِ تلافی نقصان کہا جاتا ہے اور اُس کی موت کا یقین قسمیں کھا کر دلایا جاتا ہے۔ دوسری طرف غریب اور نچلے طبقے کے مریض زندہ لاشوں کی طرح کرایے کی چارپایوں پر بے یارومددگار پڑے ہوتے ہیں اور حسرت بھری نگاہوں سے موت کا انتظار کرتے ہیں۔ اُن کی مزاج پُرسی کے لیے بھی کوئی نہیں آتا۔ اس لیئے نہیں کہ دوست، رشتے دار، احباب نہیں ہوتے بلکہ اس لیئے کہ کہیں مریض امداد نہ مانگ لے۔ اگر مر جائے تو افسوس کے اظہار میں کہا جاتا کہ اچھا ہوا مر گیا، بے چارہ غریب تھا، نہ صحت یاب ہوتا تھا نہ موت آتی تھی، تنگ تھا اللہ نے موت دے کر مہربانی کر دی اُس پر۔ یہ ہمارے معاشرے میں معاشی اور طبقاتی استحصال کی تلخ حقیقت ہے۔ تبھی جاوید اختر بھٹی معاشرے کے ان نادار، غریب، مفلس اور بے گھر افراد کو تیسری دنیا کا باسی کہتے ہیں اور ان کی محرومیوں پہ کڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے لوگ جو بھوکے پیٹ ہیں، جن کے جسم لباس کے بغیر ہیں، جن کے پاس رہنے کو جگہ نہیں، کوئی ٹھکانہ نہیں، چھت میسر نہیں۔ ایسے لوگ نہ تو ترقی یافتہ دنیا سے ہیں اور نہ ہی ترقی پذیر دنیا سے۔ ان کی دنیا کوئی اور تیسری دنیا ہے اور اس تیسری دنیا کے لوگ تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے پسے ہوئے، دھتکارے ہوئے لوگ ہیں۔ ان کے لیے افسانہ نگار شدتِ احساس رکھتے ہوئے خود کو بھی انھی کی دنیا کا باسی کہتا ہے۔ افسانہ "سندیسہ" میں اس پہلو کی عکس بندی کچھ یوں کی گئی ہے:

"تیسری دنیا کہاں آباد ہے؟ میں جانتا ہوں _____ میرے شہر میں _____ میرے ملک کے تمام شہروں میں _____ کھیتوں میں _____ شہر سے دور بستیوں میں اور کھلے آسمانوں تلے یا پرانے درختوں کی چھاؤں میں _____ سنا ہے دنیا تین حصوں میں آباد ہے، ترقی یافتہ تہذیب نے دنیا کو تقسیم

کر دیا_____ ہو گا_____ مگر میرے شہر کی تیسری دنیا_____ میرے ملک کی تیسری دنیا
_____ "کم تر" لوگوں کی دنیا ہے جو اکثریت میں ہیں لیکن جن پر اقلیت حاوی ہے۔"[۳۸]

مفلسی اور ناداری کے حوالے سے ہمارا اپنے معاشرے کی بدکار عورتوں کو گالی دینا، انھیں بدکار کہنا، شرم کا مقام ہے۔ جب ایسی عورتوں کے بچے لباس کے بغیر، بے گھر اور بھوکے پیٹ ہوں۔ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے بدکاری کی طرف مائل ہوئیں۔ ہم مہذب دنیا کے رہنے والے، اعلیٰ و متوسط طبقے کے لوگ، ان عورتوں کے لیے، ان کے بچوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے صرف انھیں گالی دے سکتے ہیں، بدکار و گھٹیا کہہ سکتے ہیں۔ دراصل معاشرے میں ایسے افراد بھی موجود ہوتے ہیں جو حساس طبع، انسان دوست اور دردِ دل رکھنے والے ہوں وہ معاشرے کے استحصال زدہ طبقے کے دُکھ، محرومیاں، ظلم و ستم، بھوک و افلاس اور اُن پہ ہونے والا سماجی تشدد محسوس کرتے ہیں مگر ان کے لیے کچھ کر نہیں پاتے۔ کیونکہ ہمارے معاشرے میں اِنچلے ہوئے، پسے ہوئے طبقے کی طرفداری کے لیے آواز بلند کرنا جرم کا ارتکاب کرنے جیسا ہے۔ افسانہ "شہ رگ" میں بھوک و افلاس پر مشتمل معاشی استحصال اور اقتصادی عدم استحکام کی روداد سنائی گئی ہے جو ایک طرف معاشرے کے افراد کی بے حسی اور سماجی رویے کی عکاس ہے اور دوسری طرف لکھنے والے کے سماجی شعور کی پختگی اور احساسِ انسانیت کا ثبوت بھی ہے۔ افسانے کی کہانی کے کردار ایک باپ اور بیٹا ہیں۔ بھوک کی شدت سے نڈھال، اُن کی ذہن میں پیدا ہونے والی سوچ اور کیفیت کو بیان کر کے لکھنے والے نے اُن کی ظاہری خدوخال کا نقشہ کھینچا ہے۔ غربت، بھوک اور مفلسی نے نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ ذہنی اور فکری طور پر بھی انسان کو مفلوج اور بوڑھا کر دیتی ہے۔ باپ اور بیٹے کی مکالمے پر مشتمل اس کہانی میں معاشرے کے اُن لوگوں کی عکاسی کی گئی ہے جو جفاکش، غریب حق گو اور خود دار ہوتے ہیں۔ اپنی محنت سے جو کماتے ہیں بس وہی کھاتے ہیں۔ کام نہ ملے تو پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور نہ ہی مفلسی، بھوک اور ناداری ان سے کوئی غلط کام کرواتی ہے البتہ انھیں وقت سے پہلے مفلوج اور بوڑھا ضرور کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ افسانے میں بھوک کی شدت اور معصومیت سے کیے گئے بچے کے سوالات اور مکالمہ، اعلیٰ طبقے اور مہذب معاشرے کے ارباب اختیار کے اعلیٰ اور مہذب ہونے پہ سوالیہ نشان ہے کہ جب بچہ اپنے باپ سے بھوک مٹانے کے لیے اللہ سے روٹی مانگنے کا کہتا ہے۔

"ابا خدا کہاں رہتا ہے؟"

"سنا ہے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب رہتا ہے"

"شہ رگ کہاں ہوتی ہے؟"

باپ نے بیٹے کی گردن پر ہاتھ رکھ کر کہا "یہاں ہوتی ہے شہ رگ"

"ابا پھر تو خدا میرے پاس بھی رہتا ہے"

"ہاں پاس ہی رہتا ہے"

"ابا"

"ہاں"

"خدا سے ایک روٹی مانگوں _____ ؟"[۳۹]

انسان کی لطف اندوزی کی جبلت بھی پیٹ کے ایندھن کے تابع ہے۔ بھوک کی شدت انسانی ذہنی سوچ کے ساتھ رومانیت یا جمالیاتی حس کو بھی مفلوج کر دیتی ہے۔ زندہ رہنے کے لیے خواہشوں کی نہیں بلکہ ضرورت کا پورا ہونا اہم ہے۔ پیٹ کا ایندھن ضرورت ہے جبکہ لطف اندوزی ایک خواہش ہے۔ افسانہ " تین اینٹیں " ایک مفلس گھرانے کی کہانی ہے جہاں بھوک نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ میاں، بیوی اور دودھ پیتی بچی تینوں بھوک سے نڈھال ہیں۔ مرکزی کردار میاں " جمیل" کو ایسی صورتحال میں حسین، راحتافزاء اور دلفریب موسم بھی نہیں بھا رہا۔ خالی پیٹ نے ذہن میں ہزار خیالات اور فکر کو جنم دے رہا ہے کہ کسی طرح اپنی بیوی اور بچی کی بھوک مٹا سکے۔ خودداری اسے ہاتھ پھیلانے سے روک رہی ہے۔ مگر کافی دن انھی فاقوں میں گزر جانے کے بعد اپنی خودداری کو ایک طرف رکھ دیتا ہے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے مگر لوگ جمیل کی بات نہیں سنتے تو گزرتے ہوئے ایک اونچی عمارت کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ جمیل کی ذہنی حالت ایسی ہے کہ اسے لگتا جیسے یہ عمارت اس کی بات سن رہی ہے اور اپنی ایک اینٹ ساتھ لے جانے کا کہہ رہی ہے۔ کہ بھوک مٹانے کے لیے میں تمہیں یہ اینٹ ہی دے سکتی ہوں۔ اپنی دودھ پیتی بچی کے لیے بھی جمیل ایک دودھیا رنگ کی عمارت سے اینٹ اٹھالیتا ہے۔ دوسرے جانب ریڈیو پر کسی حکومتی میلے کی تیاریوں کا حال احوال سنایا جا رہا ہے۔ گندم کی کٹائی مکمل ہو چکی ہے اور حکومت گندم کی زیادہ پیداوار پر میلہ منعقد کر رہی ہے کہ کسانوں نے اس سال زیادہ گندم پیدا کی ہے۔ اس کے علاوہ کہانی میں حکومتی ترقیاتی کام اور نمائشی منصوبے زور و شور سے جاری ہیں جن میں عوام کی فلاح و بہبود کا تذکرہ ہے۔ جبکہ معاشرے میں جمیل جیسے لوگوں کے گھرانوں میں بھوک و افلاس بدستور موجود ہے۔ یہ المیہ حکمرانوں اور اربابِ اختیار کی حکومت پر سوالیہ نشان ہے کہ عوام کی بھوک و مفلسی کو دور نہیں کر سکتے، اُن کی زندگی آسان نہیں بنا سکتے جو زندگی کے وجود اور بقا کے لیے ضروری ہیں اور اونچی عمارتیں بنانے کے منصوبے رکھتے ہیں۔ کہانی کا انجام بھوک و افلاس زدہ معاشرے میں حکمرانوں کے رویے اور سیاست کی بھینٹ چڑھتا ایک خاندان ہے جو بھوک اور فاقوں سے مر جاتا ہے اور حکومت گندم کی زیادہ پیداوار پر میلہ کر رہی ہے۔

"آج صبح ایک کھولی میں تین لاشیں تھیں اور تین اینٹیں _____ ایک لاش مرد کی، دوسری عورت کی، اور تیسری ایک بچی کی تھی۔ دو اینٹوں کی رنگت گندمی تھی اور ایک کی دودھیا تھی۔ اینٹوں پر دانتوں کے نشان تھے۔ جیسے کسی نے کھانے کی ناکام کوشش کی ہو۔

آج کسانوں کا میلہ ہے۔ علاقائی رقص ہو رہے ہیں۔ ریڈیو بار بار نغمے سنا رہا ہے۔ اس سال کسانوں نے گذشتہ تمام برسوں سے زیادہ گندم پیدا کی ہے مگر وہ تین لاشیں _____؟"[۴۰]

جاوید اختر بھٹی کا قلم فنِ افسانہ نگاری میں معاشرے کے مظلوم طبقے کی حمایت میں چلا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو سماج کے نچلے طبقے کے حالات زندگی کو عوام کے سامنے لانے کے لیے جاوید اختر بھٹی نے ادب کو ذریعۂ اظہار بنایا ہے اور سماجی حقیقت نگاری کے ذریعے اپنے افسانوں میں بڑی بے رحمی سے سچ بولا ہے۔ تبھی آپ کے افسانے ادب کی افسانوی تکنیک پر پورا اترتے ہیں اور یہی چیز جاوید اختر بھٹی کو مقامی تخلیق کاروں اور اُردو ادب کے بڑے افسانہ نگاروں کی صف میں لاتی ہے۔

اس کے علاوہ جاوید اختر بھٹی کے افسانے پختہ سماجی شعور کے باعث ملتان کی مقامی معاشرت کی عمدہ مثال ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جاوید اختر بھٹی نے تاریخ اور ادب کا مطالعہ ایک ساتھ کیا ہے۔ اس لحاظ سے ملتان کی دھرتی، تاریخ اور مقامیت کا بغور مطالعہ کر کے ہی آپ نے اپنے افسانوں میں نہ صرف اپنے عہد کی بلکہ اس سے پہلے کی معاشرت کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔ آپ کے افسانوں میں ملتان شہر کی تاریخ اور تہذیب و معاشرت کلام کرتی دکھائی دیتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جاوید اختر بھٹی، "شکست کے نام پر"، مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، مکتبہ اہل قلم، ملتان، ۱۹۸۱ء، ص ۲۲،۲۳

۲۔ جاوید اختر بھٹی، "احساس"، مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۳۳

۳۔ جاوید اختر بھٹی، "چبھن"، مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۱۷

۴۔ جاوید اختر بھٹی، "ایک دن"، مشمولہ "ربی ذات (افسانے)"، دارالکتاب، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۵

۵۔ جاوید اختر بھٹی، "ایک دن"، مشمولہ "ربی ذات (افسانے)"، ص ۴۶

۶۔ جاوید اختر بھٹی، "دوسرا باپ"، مشمولہ "ربی ذات (افسانے)"، ص ۵۰

۷۔ جاوید اختر بھٹی، "مالا کا موتی"، مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۱۱۲

۸۔ جاوید اختر بھٹی، "ایک دن"، مشمولہ "ربی ذات (افسانے)"، ص ۴۹

۹۔ جاوید اختر بھٹی، "احساس"، مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۳۲

۱۰۔ جاوید اختر بھٹی، "تصویریں"، مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۶۵، ۶۴

۱۱۔ جاوید اختر بھٹی، "اللہ کی زمین"، مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۴۱، ۴۰

۱۲۔ جاوید اختر بھٹی، "چاند کے زخم" مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۵۲

۱۳۔ جاوید اختر بھٹی، "چاند کے زخم" مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۴۸

۱۴۔ جاوید اختر بھٹی، "چاند کے زخم" مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۵۴

۱۵۔ جاوید اختر بھٹی، "بے نام"، مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۵۷

۱۶۔ جاوید اختر بھٹی، "احساس"، مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۳۶

۱۷۔ جاوید اختر بھٹی، "گندم کا عریاں دانہ"، مشمولہ "مگر تم زندہ رہنا (افسانے)، بیکنبکس، ملتان، ۱۹۸۹ء، ص ۲۵، ۲۴

۱۸۔ جاوید اختر بھٹی، "گندم کا عریاں دانہ"، مشمولہ "مگر تم زندہ رہنا (افسانے)، ص ۲۴، ۲۳

۱۹۔ جاوید اختر بھٹی، "لاوارث" مشمولہ "سانپوں سے نہ کاٹنے کا وچن"، قندیل پبلشرز، ملتان، ۲۰۱۶ء، ص ۴۴۔۴۵

۲۰۔ جاوید اختر بھٹی، "لاوارث" مشمولہ "سانپوں سے نہ کاٹنے کا وچن"، ص ۴۷

۲۱۔ جاوید اختر بھٹی، "کوتوال پناہ"، مشمولہ "سانپوں سے نہ کاٹنے کا وچن"، ص ۱۸

۲۲۔ جاوید اختر بھٹی، "تصویریں"، مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۲۳، ۲۲

۲۳۔ جاوید اختر بھٹی، "تصویریں"، مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۶۷

۲۴۔ جاوید اختر بھٹی، "دھواں، رات اور آدمی"، مشمولہ "ربی ذات (افسانے)، ص ۳۶، ۳۵

۲۵۔ جاوید اختر بھٹی، "دھواں، رات اور آدمی"، مشمولہ "ربی ذات (افسانے)، ص ۳۷، ۳۶

۲۶۔ جاوید اختر بھٹی، "اندھیرے مستقبل کی بشارت"، مشمولہ "مگر تم زندہ رہنا"، ص ۶۰

۲۷۔ جاوید اختر بھٹی، "زندگی"، مشمولہ "سانپوں سے نہ کاٹنے کا وچن"، ص ۵۵

۲۸۔ جاوید اختر بھٹی، "مسکن"، مشمولہ "سانپوں سے نہ کاٹنے کا وچن"، ص ۲۵، ۲۴

۲۹۔ جاوید اختر بھٹی، "فضل دین کا موبائل فون"، مشمولہ "سانپوں سے نہ کاٹنے کا وچن، ص ۳۱

۳۰۔ جاوید اختر بھٹی، "فضل دین کا موبائل فون"، مشمولہ "سانپوں سے نہ کاٹنے کا وچن، ص ۳۳

۳۱۔ جاوید اختر بھٹی، "آئی ایم سوری"، مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۷۰، ۶۹

۳۲۔ جاوید اختر بھٹی، "تلاش"، مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۱۰۰

۳۳۔ جاوید اختر بھٹی، "تلاش"، مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۱۰۵

۳۴۔ جاوید اختر بھٹی، ربی ذات (افسانے)، دارالکتاب، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۹

۳۵۔ جاوید اختر بھٹی، "سرخ ڈوپٹہ"، مشمولہ "مگر تم زندہ رہنا (افسانے)"، ص ۸۴

۳۶۔ جاوید اختر بھٹی، "آخری نوٹ"، مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۸۹

۳۷۔ جاوید اختر بھٹی، "آخری نوٹ"، مشمولہ "چاند کے زخم (افسانے)"، ص ۹۱، ۹۰

۳۸۔ جاوید اختر بھٹی، "سندیسہ"، مشمولہ "مگر تم زندہ رہنا (افسانے)"، ص ۱۶

۳۹۔ جاوید اختر بھٹی، "شہر گ"، مشمولہ "مگر تم زندہ رہنا (افسانے)"، ص ۲۲

۴۰۔ جاوید اختر بھٹی، "تین اینٹیں"، مشمولہ "مگر تم زندہ رہنا (افسانے)"، ص ۷۷